اردو ادبیات کا نقیب اور تخلیق و تنقید کا اشاریہ
ماہنامہ
سخن دان
اسلام آباد
نومبر 2021ء

اردو ادبیات کا نقیب اور تخلیق و تنقید کا اشاریہ

نومبر 2021ء ☆☆☆☆☆☆☆☆ شمارہ نمبر 07، جلد 01

ماہنامہ

اسلام آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مشمولات

مضامین

افسانے

غزلیات

نظمیں

تراجم

خطوط

اداریہ

ناقوس

تہذیبی مسلمات میں جہاں اس کے شعوری اقدار اور وجودی احوال کی اہمیت ہے وہاں تہذیب اپنے عناصرِ تشکیل میں زبان کو کلیدی درجہ دیتی ہے۔ زبان وسیلۂ اظہار ہی نہیں تہذیبی حقائق کی ترسیل اور ثقافت کے جذب انگیز اثرات کا آلۂ وجود بھی ہے۔ سطورِ آئندہ میں ''پاکستانی ادب کی لسانی استنادیت؛ احوال و امکانات'' کے حوالے سے کچھ ضروری گزارشات اور سفارشات پیش کی جاتی ہیں۔

اردو زبان برصغیر کا تہذیبی معجزہ ہے جسے طویل ریاضت کے بعد قبولِ عام حاصل ہوا۔ دہلی چونکہ سیاسی مرکز تھا اور ہندوستان بھر سے اردو دانوں کا ایک مؤثر طبقہ ہر دور میں مرکز سے وابستہ رہا جو دیگر سیاسی امور کے علاوہ زبان کی مرکزیت کے حوالے سے بھی دہلی کو ایک دبستان کی حیثیت دیتا رہا۔ بایں اعتبار دہلی اور لکھنؤ سیاسی و سماجی بنیادوں پر اردو کے بلاغتی مراکز قرار پائے اور یہاں بولی جانے والی زبان ہی دیگر علاقوں کے لیے استناد کا درجہ اختیار کر گئی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ دہلی کسی جغرافیائی تقدس کی مالک تھی بلکہ اصل سبب یہ تھا کہ اردو کے تمام تر زبان گر، زبان شناس، زبان دان اور زبان آرا لوگوں کا معتبر طبقہ یہیں تھا۔ دربارِ شاہی کی صورت میں انھیں سرپرستی ملی، باقاعدہ ادب تخلیق کیا گیا، سیاسی سرپرستی میں لغات مرتب ہوئے اور ایک خاص رجحان اور ذوق ابھرا جو ملک کے طول و عرض تک پہنچا اور ''الناس علی دین ملوکھم'' کے مصداق دہلی کی یہ ریاضتیں تمام ہندوستان میں اپنے نورِ ریاضت سے روشنی پھیلاتی ہوئی اردو کے اس رجحان کی بانی بنیں جسے خانِ آرزو نے ''زبانِ مقرر'' (ٹکسالی زبان) کہا ہے۔ لیکن اس روش میں اتنی سختی برتی گئی کہ ایک مخصوص طبقے، متاخرین میں جس کے سرکردہ مولانا حسین آزاد دہلوی تھے، نے کثیر ایسے شعرا کو مطعون ٹھہرایا جن کے ہاں دہلی یا لکھنؤ کے محاورے سے معمولی سی بھی چوک پائی گئی۔ بعدازاں اسی سلسلے میں ''اقبال کی غلطیاں''، ''حفیظ کی غلطیاں'' اور فلاں فلاں کی غلطیاں نامی کتابیں معرضِ وجود میں آئیں۔ نیاز فتح پوری کی ''مالہ وما علیہ'' بھی اسی قبیل سے ہے۔ مولانا حسین آزاد دہلوی کی ''آبِ حیات'' میں بھی ایسے آثار بکثرت ملتے ہیں۔ اردو کے بعض لغات خصوصاً مہذب اللغات میں لکھنؤ کی برتری کا جو محاکمانہ رویہ روا رکھا گیا ہے، اس نے لغت نویسی کے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی تو کی ہی ہے، اس سے ایک خاص شدت پسندی کا مظاہرہ کرنے والے طبقہ کو ضخیم لغتی سرپرستی بھی حاصل ہوئی اور اس کے اثرات مابعد پر جو پڑے، وہ ایک خاص حد تک جائز بھی تھے اور قانونی بھی مگر آج ان کی حیثیت کم از کم قانونی نہیں رہی۔

پاکستان کی قومی زبان کے سلسلے میں تاریخی حقائق اور سیاسی جھگڑے میرا موضوع نہیں۔ پاکستان نے اردو، جو کہ غیر ملکی زبان تھی اور پاکستانیوں کی فطری اور موروثی زبان بھی نہیں تھی، کو اکتسابی عمل سے حاصل کیا۔ اس تحصیل کے مآخذ میں مہاجرین کا اہم کردار ہے۔ وہ مہاجرین جن کی زبان اردو تھی، ظاہر ہے ایک مضبوط لسانی پس منظر رکھتے تھے اور اردو کی شعری و ادبی روایات کے امین بھی تھے اور اردو میں زبان و بیان کی ایک پختہ روایت تھی جس کی جڑیں

ان کے تہذیبی ورثے میں پیوست تھیں جس کا انھیں شعوری احساس بھی تھا۔ ہجرت کے بعد پاکستان میں مہاجرین کی زبان دانی کے اسی احساسِ برتری نے مقیم ملکیوں کے لیے کمتری کے احساس کو فروغ دیا۔ چونکہ مہاجر ثقافت نے رفتہ رفتہ نئے ادبی منظر نامے کی تشکیلِ نو کی۔ ادبی مراکز ظہور پذیر ہوئے اور مہاجرین کی نوجوان نسل ادبی، علمی اور سیاسی مباحث کے میدان سجا کر محفلیں گرم کرتی رہی۔ مشاعروں کا سلسلہ جنباں ہوا اور یوں گویا پورا ادبی منظر نامہ تشکیل بندی کے عمل سے دوچار ہوا۔ ان مہاجر ادیبوں اور شعرا کے معتقدات میں ٹکسالی زبان کے طور پر سب سے بڑا حوالہ دہلی اور لکھنؤ کا تھا۔ وہی زبان فصاحت گستری کے معیار پر پوری اترتی متصور کی گئی جو ہندوستان کے ادبی مراکز میں بولی جاتی رہی اور یہ روش شدت سے جاری رہی۔ اس سختی کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کی استنادیت کے حوالے سے دہلی اور لکھنؤ کی چھاپ یہاں پاکستان میں بھی مطلوب ہونے لگی۔ رئیس امروہوی خاندان کو تو مصحفیؔ کے ذیل میں مولانا حسین آزاد نے پہلے ہی ''امروہہ پَن'' کے عیب سے متصف کر دیا تھا، یہاں ان کی کیا دال گلتی، سو یہاں بھی دہلی اور لکھنؤ ہی کا نقارہ بجا۔ اس اعتراف میں کوئی عار محسوس نہیں کرنی چاہیے کہ شروع میں یہ نقارہ کسی اذانِ صلح سے کم نہیں تھا بلکہ شاید اس کی ضرورت بھی تھی تاکہ ابتدا میں مرکزیت قائم رہے لیکن پچھتر سال گزر جانے کے بعد بھی آج کا ادیب یا ناقد ادبی نزاعات میں لسانی حوالوں کے ضمن میں میرؔ و سوداؔ، مومنؔ و جراتؔ، داغؔ و امیرؔ اور آتشؔ و ناسخؔ کی بولی ہی کا راگ الاپتا دکھائی دیتا ہے۔ اُن بزرگ کلاسیکی زبان شناسوں کی زبان دانی بلکہ زبان گری سے کسے اختلاف! لیکن زبان جیسے تیز ترین ارتقائی عمل سے گزرنے والے سیلاب کے آگے فرسودہ بند باندھنا یا اس پر اصرار کرنا قرینِ انصاف نہیں ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ زبان میں فصاحت کا کیا درجہ ہے اور فصاحت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ کیا پاکستانی شعرائے اولین، ناصرؔ کاظمی، احسان دانشؔ، رئیسؔ امروہوی، قتیلؔ شفائی، ظہیرؔ کاشمیری اور احمد ندیمؔ قاسمی وغیرہ کی زبان درست نہیں تھی؟ کیا ہمارا ادیب Eric Partridge کی طرح زبان کی تقسیم Familiar, Ordinary اور Literary سے کرتا ہے؟ اگر کوئی کرے بھی تو اس تقسیم سے انصاف پسند ذہن قطعاً مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ زبان کے معاملے میں معیار کا من و سلویٰ اوپر سے بنا بنایا نہیں اترتا، ہمیشہ نیچے سے ابھر کر اوپر آتا ہے البتہ اوپر کا طبقہ پاسبان بن جاتا ہے کیونکہ وہ سنجیدہ، متحمل، توسیع پسند اور قابلِ قدر محترم سماجی معنویت کا حامل ہوتا ہے۔ افسوس کہ پاکستان کا اعلیٰ طبقہ جسے دیگر عوامل کے ساتھ زبان کی سیاسی سرپرستی بھی کرنا تھی، خود انگریزی کی زلہ خواری میں مصروف رہا اور اردو محض عوامی سطح کی ادبیت کے درجے پر کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہی۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ پاکستان کو زبان اور اس کے ارتقا سے واقف کار لوگ ہر دہائی میں میسر آتے رہے۔ تاریخی اصول پر مرتب ہونے والی ضخیم لغت میں بھی ہندوستان کے کلاسیکی و جدید لٹریچر سمیت پاکستان کے شعری و نثری تحریری مواد کو معیار بنایا گیا۔ خیر سے لغت تو رہی الفاظ کے استعمال کی تاریخی دستاویز، اسے محاکمہ سمجھنا دانش مندی نہیں۔ بر سبیلِ تذکرہ لغت کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ زبان کے معیارات کا دائرہ اس لغت میں وسیع سے وسیع تر رہا ہے۔ کوئی بھی لفظ جو تواتر کے ساتھ (یعنی نصف صدی میں مسلسل ہر دور میں بولا جاتا رہا) مستعمل رہا، وہ اس میں درج کر دیا گیا۔ ان مندرجات کو بنیاد بناتے ہوئے پاکستانی دور کے تحریری مواد کو زبان کے محاورے یا روزمرے کے حوالے سے سند بنائے جانے میں کسی قسم کا تامل روا رکھنا دانش مندی نہیں ہے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ بقول شان الحق حقی ''یہ تکلفِ بیجا ان کی ذہنی عادت بن گیا ہے۔'' خسروؔ کا شعوری تجربہ جو بھی ہوا ہو لیکن اس نے بات بہت پتے کی کی کہ:

چو غرقِ آبِ حیاتم، چہ آب می جویم
چو با من است نگارم، چہ می روم چپ و راست

زبان کی جدید تشکیل میں اردو کا بہت فائدہ ہوا۔ مثلاً مصادر میں لاحقہ بڑھا کر قبولنا، وصولنا، تلاشنا، انگیزنا، قلمانا، خمیانا، اردوانا وغیرہ بیشمار نئی وضعی صورتیں بنیں۔ ہندی، فارسی اور عربی الفاظ کی باہمی تراکیب سے، کٹ حجتی، میل خورا، لاپتہ، غل غپاڑہ جیسے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں نئے نئے معنوی سیٹ بنے۔ اب ان قواعد کو کوئی نہیں پوچھتا کہ "ترکیب عطفی ہو، توصیفی ہو یا اضافتی، ہر لحاظ سے یہ قانون ہے کہ فارسی اور عربی کے اصل الفاظ ہی باہم ترکیب میں آسکیں گے۔ خالص اردو، ہندی یا سنسکرت کا لفظ کسی بھی عربی یا فارسی لفظ سے ترکیب میں نہیں ہو سکتا۔" البتہ زبان کے معاملے میں معیار کا مسئلہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ عموماً اعلیٰ طبقے کی زبان مستند سمجھی جاتی ہے لیکن زبان میں قبولیت اور معنیٰ افزائی کا مسئلہ عوام ہی طے کرتی ہے اور ترقی پذیر معاشرے کی عوامی بولی تو بہت جلد اوپر اٹھتی ہوئی استناد کے درجے کی قابلیت پیدا کر لیتی ہے۔ مثلاً روما کی عوامی زبان جسے Low Latin کہتے تھے بالآخر ٹکسالی زبان بن گئی جس کی دھوم ایک دنیا تک ہے۔ بڑی بڑی زبانوں میں جو تصرفات ہوئے، وہ مولویوں، پنڈتوں یا پروفیسروں نے نہیں کیے، عوام نے سرانجام دیئے۔

ہر ریاستی یا قومی معاشرے میں عوام کالانعام اور پڑھے لکھے مؤثر طبقے کا تناسب ایک دہائی رہا ہے۔ زبان میں الفاظ کی گھڑت، وضعِ جدید، تغیر، لہجہ، انطباقاتِ جدیدہ، محاورے میں توسیع و تغییر وغیرہ سب عمل عوام ہی کرتی ہے البتہ تب تک فصاحت کے درجے پر فائز نہیں ہوتی جب تک متعلقہ زبان کا سنجیدہ، مزاج شناس اور پڑھا لکھا طبقہ استعمال میں لا کر اعتبار نہ بخش دے۔ اسی عمومی اصول کی بنیاد پر جبکہ پاکستانی زبانوں کے مختلف محاورے، لہجے اور الفاظ اردو میں کھپ رہے ہیں اور شعر و نثر میں تواتر سے جگہ بنا رہے ہیں، پاکستانی اردو کا ساٹھ ستر سالہ جدید لب و لہجہ، محاورہ، لسانی ساخت اور روزمرہ نہ صرف قابلِ اعتبار ہو سکتا ہے بلکہ مستند اور معیاری بھی۔

غیر سرکاری پاکستانی زبانوں کے اردو پر واضح ترین اثرات کے بعد پاک و ہند کی اردو بول چال (چاہے ادبی ہو یا غیر ادبی) میں بہت نمایاں فرق آچکا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں پاکستان میں فصاحت کا درجہ اسی لب و لہجے کو دیا جائے گا جو یہاں مطلوب ہے چہ جائے کہ اس کا موازنہ بھی میرؔ و میرزاؔ سے کرتے ہوئے فصاحت کے معیارات متعین کیے جائیں! اس سلسلے میں جلد بازی اور ہٹ دھرمی ہمارا شیوہ قطعاً نہیں ہونا چاہیے بلکہ درجِ ذیل سفارشات کی روشنی میں حقائق کا جائزہ لے کر زبان جیسی لچکدار چیز کے معاملے میں انصاف پسندی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ جو اپنے محسنوں اور بڑوں کو بھلا کر بڑا بننا چاہے، وہ ہمیشہ چھوٹا رہ جاتا ہے، لیکن آج کا کوئی شادانی فصاحت کے معیارات تولتے ہوئے پلڑے میں جراتؔ و انشاؔ کو بٹھائے تو اسے کٹ حجتی اور بد معاملگی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے!

سفارشات

۱) روزمرہ اور محاورے کی پاسداری سے زبان کی مرکزیت قائم رہتی ہے، لہٰذا اردو کے مستند ادب پاروں، شعرا اور لغات کی استنادیت پہ بھروسا کرتے ہوئے یکلخت روگردانی کی بجائے اعتدال اور توازن برقرار رکھا جائے۔

۲) مستند اردو کے وہ مراکز جو عموماً بڑے لغات و فرہنگ کے لیے قابلِ اعتماد رہے، مثلاً دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، الہ آباد، اورنگ آباد، وغیرہ، ان کی بولی اور روزمرے کی صحت تسلیم کرتے ہوئے فصاحتِ زبان پہ حتی الوسع اتفاق روا رکھا جائے تاکہ زبان کا مرکزی مایۂ خمیر منتشر نہ ہونے پائے۔

۳) چونکہ زبان ترقی کرتی ہوئی ایک سماجی عنصریت کی حامل اکائی ہے، لہٰذا بڑھتے ہوئے رجحانات اور لسانی ساختوں میں متنوع تبدیلیوں کے پیشِ نظر نئی نسل کے اکابر زبان شناس شعرا اور ادیبوں کی زبان پر اعتماد کیا جائے اور

ضمنی لسانی و بیانی نزاعات میں ان کی استنادی حیثیت کو تسلیم کر کے ممکنہ فیصلے صادر کیے جائیں۔

٤) چونکہ قیامِ پاکستان کو 75 سال گزر جانے کے بعد اب تک پاکستان کا اردو کو بطورِ قومی زبان قرار دینا اور اردو کا بڑی سطح پر فروغ پانا ایک امرِ واقع ہے۔ لہٰذا اس طویل دورانیے میں نئے محاورے، تذکیر و تانیث کے فرق، روزمرے کی نئی نئی گھڑتیں، اور زبان شناس ادیبوں اور شعرا کی ایک مستند کھیپ کا مستقل اردو میں لکھنا اور زبان میں توسیع پسندانہ رویہ روا رکھنا اس جدت کی طرف برانگیختہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ پاکستان کی بولی ایک مستقل اور مستحکم زبان کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور زبان چونکہ ایک آلۂ اظہار ہے، اس حیثیت سے پاکستانی شہریت رکھنے والے تمام افراد کی متفق علیہ قومی زبان اردو ہی ہے، لہٰذا اظہار و بیان کے اصولوں کی بنیاد پر ان ادیبوں کو مستند مانا جانا عقلاً ادبی جواز رکھتا ہے۔ پس اس پر اصرار نہ کرنا چاہیے کہ کسی اصولی یا فروعی لسانی نزاع پر لکھنؤ یا دہلی ہی سے سند کا مطالبہ کیا جائے!

٥) پاکستان میں بھی وہی زبان مستند اور معتمد علیہ کہی جائے جو فصحا اور استاذ ادبا کے ہاں جذب ہو کر ایک مستقل محاورے اور روزمرے کا درجہ اختیار کر جائے اور اہلِ ذوق اسے بغیر کسی ضابطہ بندی کے قبول کر لیں۔

٦) نجی سطح پر ہونے والے تغیرات اور بے جا توسیعی توڑ پھوڑ کی مجموعی سرپرستی کرنے کی بجائے اردو کے مزاج شناس ادبا و شعرا سے رجوع کیا جائے۔ اس سلسلے میں حفیظؔ جالندھری، فیض احمد فیضؔ، مصطفیٰ زیدی، ناصرؔ کاظمی، صوفی تبسمؔ، حفیظ ہوشیارپوری، باقیؔ صدیقی، احمد ندیمؔ قاسمی اور شان الحق حقیؔ خصوصیت کے ساتھ مذکور ہیں۔ ان بزرگوں نے اردو میں اگرچہ بڑے پیمانے پر کوئی توسیع پسند تجربات کا غلغلہ برپا نہیں کیا لیکن مستند زبان ضرور بولی ہے۔ لہٰذا میرؔ و سوداؔ ہی پر اکتفا کرنے کی روش بلکہ اصرار کی گرم مزاجی کو قدرے سرد پڑنا چاہیے۔

٧) پاکستان میں اردو دان طبقے کی جغرافیائی حیثیت جو بھی ہو، انھیں بالخصوص کراچی، اسلام آباد اور دیگر وہ شہر جہاں اردو کی سماجی حیثیت برتر ہے، ان کا روزمرہ و محاورہ مستند سمجھا جائے لیکن اس سلسلے میں بھی وہ مستند زبان شناس ادیبوں اور شعرا کی سرپرستی میں ہوں ورنہ محض اردو معاشرے کی زبان میں نجی اور معمولی سطح کی تغییر کو حرفِ آخر سمجھنے کی ضد کو قبولیت کے لائق نہ سمجھا جائے۔

٨) کشمیری، پنجابی، سندھی، بلوچی اور پٹھان معاشرے میں اردو کی سند کے لیے ان ادبا وغیرہ کی زبان کافی سمجھی جائے جو اردو اکثری شہروں میں تواتر سے اردو کے مراکز ہیں۔

٩) پاکستان میں فطری طور پر پیدا شدہ نئے روزمرے کی خلاف ورزی کرنا، اسے جبراً دبانا اور اس پر دہلی و لکھنؤ کی زبان کو برتر سمجھنا حوصلہ افزا عمل نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ اجتماعی اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔

ان سفارشات کی روشنی میں کسی مستقل حکمتِ عملی کی ضرورت نہیں ہے۔ معاصر شعرا اور ادیبوں کے ہاں اول تو اب لسانی و بیانی معرکے رہے ہی نہیں جو زبان کو توسیع سے نوازتے اور ذوقِ سلیم کی تسکین کا سامان کرتے ہوئے کسی پر مغز نتیجے پر پہنچتے تھے، لیکن خوش قسمتی سے ایک خاص رجحان اب بھی سرگرم عمل ہے جو زبان میں اسی ٹکسالی پن کو درست سمجھتا ہے جو دو صدیاں قبل کا اس کا رائج اور فصیح رویہ تھا جس کی محاکمانہ شان کا اندازہ اردو ادب کے معرکوں کی تاریخ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اسی خاص رجحان کی سمت موڑنے کی ضرورت ہے۔

امبرین کوثر

مابعد نو آبادیات؛ حدود و تعارف

جب سے دنیا بنی ہے زمین پر انسان کبھی حاکم بنتا ہے تو کبھی محکوم۔ انسان کا ایک دوسرے پر غلبہ پانا اس کی اولین ترجیحات میں سے ہے۔ یعنی غلبہ پانے کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ ابتدا میں جب انسان غار میں رہتا تھا تو اس دور میں بھی طاقت ور قبیلے نے ہمیشہ کمزور بنا کر اپنے زیر اثر رکھا۔ اپنی طاقت کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے ہمیشہ اس نے کمزور کی حق تلفی کی، اس کی آواز کو دبا کر رکھا۔ طاقت ور طبقہ نے نہ صرف کمزور کے وسائل پر قبضہ کیا بلکہ ان کی جانیں تک ضائع کرتا رہا۔ ان کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے طرح طرح کے ہتھ کنڈے استعمال کرتا اور کمزور دب کر رہ جاتا۔

> ''کوئی معاشرہ یا انسانی تاریخ کا کوئی عہد کشمکش، غلبہ پسندی اور چھینا جھپٹی کی معروف اور غیر معروف صورتوں سے خالی نہیں رہا ہے۔''[01]

اور طاقتور 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کے تحت حکومت کرتا نظر آتا۔ خدا تعالیٰ نے اس کائنات کو ہزار ہا نعمتوں سے نوازا ہے زمین کے اندر اپنے بیش قیمتی خزانے پیدا کیے اور اس کو نکالنے کی سعی انسان پر چھوڑ دی۔ اس طرح اس زمین کے ہر حصے میں مختلف قسم کی معدنیات بانٹ دی۔ انسان جو ازل سے آگے بڑھنے کی سعی کرتا چلا آ رہا ہے، ان خزانوں کی تلاش کے لیے نکل پڑا اور زمین کو کھودتا گیا۔ کائنات کا ہر خطہ چونکہ مختلف قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ یہ وسائل کسی خطہ میں کم ہیں اور کسی خطہ میں زیادہ ہیں۔ اس طرح جب اس خطہ میں رہنے والے لوگوں نے ان وسائل کا استعمال کرنا شروع کیا اور آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ وسائل کم ہوتے گئے تو اس خطے یا ملک کی قوم نے ان خطوں سے دوسرے خطوں کی طرف ہجرت کی اور پھر جہاں ان کا بس چلا انھوں نے لوٹ مار اور ظلم و ستم شروع کر دیا۔

وسائل کو حاصل کرنے کے لیے طاقتور قوم نے مختلف حکمت عملی استعمال کی اور اپنی طاقت کی دھاک بٹھا دی۔ جب بھی یہ قوم کسی جگہ یا خطہ میں جاتی تو وہاں پر جا کر نئی آبادیاں بنا لیتی اور اپنے اصول و ضوابط قائم کر لیتی۔ ان نئے بسنے والوں کے لیے آباد کار کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور ان کی بنائی گئیں آبادیوں کو نو آبادیاں کہتے ہیں۔ انگریزی میں نو آبادی کے لیے ''کالونی'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے:

> Colonialism word comes from the Roman 'Colonia' which meant farm or settlement and referred to Romans who settled in other lands but still retained their citizenship. [02]

اردو میں بھی لفظ کالونی ہی استعمال کیا جاتا ہے جس کا مطلب نئی آبادی بنانا ہے۔ ان آبادیوں کے بنانے والوں کے بارے ہر طرح کا علم نو آبادیات کہلاتا ہے۔ چونکہ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں طاقت ور ہمیشہ کمزور کو یرغمال بنا کر رکھتا ہے اور ان کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھ کنڈے استعمال کرتا ہے۔ اس کے لیے وہ قبیلوں کی شکل میں رہتا ہے اور اپنی اس طاقت کو بڑھاتا رہتا ہے۔ نو آبادیاتی نظام میں عام طور دو اہم کردار ہوتے ہیں ایک مقامی لوگ اور دوسرے نئے آنے والے یعنی آباد کار۔

مقامی لوگوں سے مراد کسی بھی خطہ میں رہنے والے رہائش پذیر لوگ ہیں۔ ان دونوں کرداروں کا آپس میں ایک تعلق ہوتا ہے اور اسی تعلق کی بنا پر ہی اجارہ داری قائم ہوتی ہے اور ایک خطے کا استحصال ہوتا ہے۔ کیونکہ حکومت کرنے، حق چھیننے اور اپنی طاقت کا سکہ منوانے کے لیے ایک دوسرے وجود کی ضرورت ہوتی ہے۔ نوآبادیات جو کہ ایک بہت اہم موضوع ہے اور جس پر جتنی بحث کی جائے کم ہے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل بات سامنے آتی ہے:

''انسان نے قدیم غیر طبقاتی نظام سے نکل کر خاندان، جائیداد اور ریاست کی تکون میں قدم رکھا تو وہ اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات میں تقسیم ہو کر استحصال کا شکار ہونے لگا وہاں اس نے دیگر انسانی گروہ پر قبضوں اور فتوحات سے ابتدائی نوآبادیات کا آغاز کیا۔'' [03]

نوآبادیاتی عہد میں آباد کار محکوم قوموں کی شناخت ختم کرنے اور ان کے شخصی تشخص کو پامال کرنے کے لیے ایسے طریقے اور ذرائع استعمال کرتا ہے کہ ایک عام فہم و فراست والا انسان یہ سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے کہ آیا یہ طریقے اس کی بھلائی کے لیے لاگو کیے جا رہے ہیں یا اس میں آباد کار کا اپنا کوئی مفاد شامل ہے اور پھر آباد کار اس مقامی آبادی کے لوگوں کو جانور کی طرح اپنی لاٹھی (حکمتِ عملی اور چالوں) سے ہانکتا چلا جاتا ہے اور آباد زدہ بھیڑ بکریوں کی طرح ان کے حکم پر چرتے پھرتے نظر آتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا کام بس چارے سے ہے۔

اس حوالے سے ناصر عباس نیر کچھ اس طرح کہتے ہیں کہ:

''نوآبادیاتی عہد میں محکوم ملکوں کی تاریخ کو مسخ کرنے کے لیے آئیڈیالوجیکل طریقے اختیار کیے گئے مگر ان کا اثر وہی ہوا جو نفسی تشدد کے نتیجے میں کسی شخص کے حافظے پر ہوتا ہے اور وہ واقعات کو الگ الگ دیکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔'' [04]

نوآبادیاتی فضا قدرتی نہیں ہے بلکہ اس کو پیدا کیا جاتا ہے۔ اس عہد، فضا، آب و ہوا کو بنانے میں ایک دن یا ایک مہینہ نہیں لگتا بلکہ اس کے لیے سالوں بیت جاتے ہیں۔ مختلف پالیسیاں اور حکمتِ عملیاں بنائی جاتی ہیں یہ ایک سوچا سمجھا اور طے شدہ منصوبہ ہوتا ہے۔ پھر ان پالیسیوں کو اپنے سے کم طاقتور لوگوں پر لاگو کیا جاتا ہے۔ ان اصولوں کو لاگو کرنے کے لیے آباد کار کو کچھ معاون لوگوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور یہ معاون لوگ ان کے اپنے دل چاہے اور من پسند ہوتے ہیں:

''نوآبادیادتی صورت حال، فطری اور منطقی صورت حال نہیں ہے، اسے پیدا کیا جاتا اور تشکیل دیا جاتا ہے اس لیے مخصوص مقاصد کو سامنے رکھا جاتا ہے۔'' [05]

برصغیر (ہندوستان) جس کو خدا نے لاتعداد قدرتی وسائل سے مالا مال کیا ہے۔ ابتدا سے ہی مختلف خطوں اور قوموں کے باشندوں کی اس زرخیز خطے پر نظر رہی ہے اور انھوں نے اس خطے کو اپنے اپنے انداز سے لوٹا ہے اور اس پر اپنی طرزِ حکومت قائم کی ہے۔ اس حسین ملک پر کبھی عربوں نے اجارہ داری قائم کی تو کبھی تُرکوں نے، کبھی ایرانیوں نے اس لوٹا تو کبھی یونانیوں نے، الغرض جس قوم کا دل چاہا اس نے من مانی کی اور اصول و ضوابط کو نافذ کرتے چلے گئے۔

نوآبادکار آتے تو تجارت کی غرض سے تھے لیکن یہاں پر ان ایک ہی مقصد تھا اور خام مال کو اپنے خطوں تک پہنچانا اور اس کے بدلے چند سرمایہ مقامی لوگوں کے سپرد کر دینا۔ مختلف قوموں کی طرح برطانوی حکومت نے بھی اس زرخیز خطے پر راج کیا اور اس راج کے لیے انھیں کئی سال جدوجہد کرنا پڑی اور بالآخر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے۔

کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا کبھی درانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی ایک شائستہ قوم مغرب کی [06]

اور ایک وقت ایسا آیا جب انھوں نے پورے برصغیر پر ڈیرے جما لیے اور نہ صرف خام مال حاصل کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کی شناخت کو بھی مسخ کر دیا۔ یہ 1857ء کا وقت ہے جب انھوں نے ہندوستان پر مکمل قبضہ کر لیا اور اپنے اصول و قوانین کے مطابق حکومت کرنا شروع کر دی۔ سب سے پہلے مقامی آبادی کا اعتبار حاصل کرنے کے لیے انہوں نے تجارت کے لیے ایک کمپنی کو قائم کیا اور پھر آہستہ آہستہ وہ پورے ملک پر حاوی ہوتے گئے۔
انگریز نے اپنی سازشوں سے خانہ جنگی کا آغاز کروایا اور ہندوستان کے بڑے بڑے عظیم اور بہادر لوگوں کو جان کی بازی ہارنا پڑی۔ نوآبادکاروں نے اپنی حکومت کو بہتر طریقے سے چلانے کے لیے سب سے پہلے ہندوستان کی زبانوں پر عبور حاصل کیا اور اس کے بعد مقامی لوگوں کی ثقافت کو سمجھنے کے لیے ان کی کتابوں کے تراجم کروائے اور ان کا بغور مطالعہ کیا۔ کسی ملک کی ثقافت کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ اس کی اساس اور پہچان اس کی ثقافت پر مبنی ہوتی ہے۔

> ''اٹھارھویں صدی سے دوسرے نصف تک ہندوستان میں کمپنی نے قدم جما لیے تھے۔
> اہم سیاسی اور تجارتی کامیابیوں کے بعد اپنی اس خواہش کے لیے کوشاں ہوئی جسے ثقافتی
> غلبہ کہنا چاہیے۔'' [07]

زبانوں پر عبور حاصل کرنے اور اپنے علم کو اعلیٰ ثابت کرنے کے لیے انہوں نے فورٹ ولیم کالج بنایا۔ یہ کالج بھی ان کی سیاسی اور چالوں میں سے ایک چال تھی ان کا مقصد صرف ہندوستان کی سیاست اور تعلیم کو ٹھیس پہنچانا تھا۔ ہندوستانیوں نے اس کالج کو اپنے لیے فائدہ مند سمجھا اور اس کے پس منظر میں چھپا انگریز کا مکروہ چہرہ نہ دیکھ سکے لیکن ایک طرح سے یہ کالج عوام کے لیے فائدہ مند بھی ثابت ہوا کیونکہ اس میں ان کو اس علوم سے آگہی ملی جس سے وہ پہلے ناواقف تھے۔ یہ کالج اردو زبان اور اس کی ترویج کے لیے بھی کافی سودمند ثابت ہوا۔ کیونکہ بہت سی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا:

> ''فورٹ ولیم کالج کے قیام کے محرکات سیاسی تھے۔ لیکن اس کے ثمرات نے بالواسطہ
> اور بلاواسطہ طور پر ادب کو بھی متاثر کیا اور اردو نثر کی ایک موثر تحریک کو جنم دے دیا۔
> یہی وجہ ہے کہ اردو کا مورخ فورٹ ولیم کالج کو ہمیشہ تحسین کی نظر سے دیکھتا
> ہے۔''[08]

انگریز کا کام عوام کی نگہداشت نہ تھا بلکہ ان کہ کام اس خطے میں زندگی کے ہر پہلو مذہبی، سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تعلیمی میدان وغیرہ کا استحصال کرنا تھا۔ اس سب کے لیے انہوں نے مرکز ثقافت کو رکھا اور اپنی حکمت عملیوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جدا اور متنفر کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے مذہبی رسوم و رواج کو بھی پامال کیا:

> Many colonial rulers forced their way of life on the people of their colonies. They did so partly, because they considered the culture of the colonial people inferior to their own. Many rulers tried to convert the colonial people to their own religion. They also made their own language, the official of the colonies. In many case, colonial rulers tried to replace the native culture with their culture. [09]

برطانوی حکومت نے علم اور طاقت (فوج) کی بنا پر نہ صرف ہندوستان میں بلکہ اور بھی مختلف ملکوں پر

استعماریت قائم کی اور ظلم و جبر کے پہاڑ توڑے۔ ان ممالک میں امریکہ، آسٹریا، برما، مشرقی و مغربی افریقہ، ساؤتھ افریقہ، مصر، ویسٹ انڈیز، ایسٹ ایشیاء اور نیوزی لینڈز وغیرہ شامل ہیں۔ برطانوی حکومت نے افواج کی مدد سے ان ممالک پر چڑھائی کی اور ان پر قبضہ جماتے ہوئے اپنی طاقت کالوہامنوایا۔ کئی سالوں تک برطانوی حکومت نے ہندوستان پر قبضہ جمائے لیکن مکمل طور پر اقتدار 1857ء کی جنگ کے بعد ان کے ہاتھ میں آگیا۔ پھر یہ وسیع سلطنت انگریز کے ہاتھ میں آگئی اور سامراج نے برصغیر پر مکمل قبضہ کر لیا۔ یوں سامراجیت کا شکار ہونے کے بعد ہندوستان اپنی اصل (ثقافت، سیاست، تعلیم اور مذہب وغیرہ) گم کر بیٹھا۔ یوں ہندوستان پر سامراج کی حکومت 1947ء تک قائم رہی اور اس کے بعد ان کو یہ ملک چھوڑ کر جانا پڑا۔

سامراج تو چلا گیا لیکن اپنے پیدا کردہ اصول و قوانین کو ہندوستانیوں کے گلے کا طوق بنا گیا، جس سے آج تک مقامی باشندے چھٹکارا نہیں پا سکے اور ابھی تک نوآبادکاروں کے بنائے گئے غلامی کے کانٹوں پر چل رہے ہیں۔ اس دور کو مابعد نوآبادیات کہتے ہے۔ یعنی 1947ء کے بعد کا وہ دور جب ہندوستانیوں نے بظاہر تو آزادی حاصل کر لی، لیکن ذہنی طور پر وہ محکوم ہی رہے اور آج بھی محکوم قوم ہی سمجھے جاتے ہیں۔ مابعد نوآبادیات ایک ایسا تاریخی عمل ہے جو نوآبادیاتی سیاسی اور ثقافتی غلبے کے رد عمل میں سامنے آیا۔ اسی طرح یونگ کے مطابق :

> Post colonialism claims the rights of the people on this earth to the same material and cultural well beings. [10]

نوآبادیاتی نظام چونکہ ایک معاشرہ کی سیاسی، ثقافتی، سماجی اور علمی استحصال کی ایک صورت ہے اور اس استحصال میں بنیادی طور پر ثقافت اور علم کو مرکزیت حاصل ہے۔ آبادکاروں کو اپنے مفاد کے لیے اور اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کے لیے مقامی باشندوں کے ذہن اور نفسیات کو بھی تسخیر کرنا ہوتا ہے۔ اپنی ثقافت، تہذیب اور علم کا بیانیہ وہ آباد زدہ قوم کے سامنے رکھتا ہے اور ان کو احساس کمتری میں مبتلا کرتا ہے۔ ہندوستان میں بھی آبادکاروں نے اپنے آپ کو مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کے طور پر پیش کیا اور ان کو غیر مہذب اور جنگلی کہا۔

سرسید احمد خان نے اپنے مضمون ''نئی تہذیب'' میں اس جانب کچھ اس طرح اشارہ کیا ہے کہ :

> ''(یورپین) کہتے ہیں کہ ہندوستانی بندر کے موافق ہیں جو چوتڑوں کے بل زمین پر بیٹھتے ہیں۔ بندر کے موافق کھانے میں ہاتھ سان کر کھانا کھاتے ہیں۔ کوئی تہذیب ان کی معاشرت میں نہیں ہیں ہے۔ وحشیوں سے کسی قدر بہتر ان کا لباس ہے۔ گو قطع اس کے مشابہ ہے جو جنگلی وحشی نامہذب قومیں اب تک پہنتی ہیں۔'' [11]

برطانوی حکومت نے نوآبادیاتی ممالک میں نہ صرف علوم کے میدان میں اپنی دھاک بٹھائی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس نے سیاسی غلبہ بھی حاصل کر لیا۔ کوئی بھی قوم جب کسی ملک میں جاتی ہے تو اس کو وہاں پر اپنے مددگار لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ مددگار لوگ ان کے اپنے (آبادکار) نہیں بلکہ مقامی ہوتے ہیں جو اپنی ہی قوم (آبادزدہ) سے غداری کرتے ہوئے سامراج سے کچھ معاوضے کے تحت وفاداری کرتے ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کے بعد، مابعد نوآبادیاتی تجزیہ کا مرکز کولونیل ازم ہے۔ کولونیل ازم کیا ہے؟ اور اس کا مابعد نوآبادیاتی نظام سے کیا تعلق ہے؟ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ کون سا نظام حکومت ٹھیک اور کون سا غلط ہے؟ ان سب سوالات کا جواب نوآبادیات میں ملتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے مطابق :

''کولونیل ازم ایک نیا ڈرامہ تھا، جس کا اسکرپٹ یورپ نے لکھا اور جسے کھیلنے کے لیے

ایشیا و افریقہ کی سر زمین کو منتخب کیا۔ ڈرامے کے مرکزی کردار یورپی تھے، تاہم کچھ
معاون اور ضمنی کردار ایشیائی او افریقی تھے۔'' [12]

نو آبادیات کے ساتھ ایک اور لفظ امپیریل ازم بھی استعمال ہوتا ہے۔ امپیریل ازم اور کولونیل ازم دونوں میں ایک تاریخی رشتہ ہے لیکن یہ دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہے۔ امپیریل ازم جس کا مقصد صرف سیاسی اطاعت کا ہی خواہش مند ہونا ہے اس اطاعت میں وہ کسی کی ثقافت کو مسخ نہیں کرتا، نہ ہی ظلم، جبر اور تشدد سے کام لیتا ہے اس کا اہم مقصد صرف سیاسی غلبہ پاتے ہوئے اپنے محدود خطے (سر زمین) کو مزید وسیع کر کے اپنی برتری کا پرچم لہرانا ہے۔ نو آبادیاتی نظام (کولونیل ازم) اس کے برعکس ہے، اس کا مقصد نہ صرف سیاسی غلبہ حاصل کرنا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ اپنے ظلم و جبر اور تشدد سے مقامی لوگوں کی ثقافت کو مکمل طور پر مسخ کر دیتا ہے۔ ایڈورڈ سعید کے مطابق:

Imperialism means the practice، the theory، and the attitudes of a dominating metropolitan centre ruling a distant territory 'colonialism' which is almost always a consequence of imperialism، is implanting of settlements on distant territory. [13]

آباد کاروں نے اپنی حکمت عملی کے تحت ہندوستان کے باشندوں کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر ٹھیس پہنچائی۔ ہندوستان میں اس وقت مغلوں کی سلطنت تھی اور سرکاری زبان فارسی تھی۔ انگریز نے اس زبان کو غیر ترقی یافتہ اور غیر مہذب قرار دے کر انگریزی زبان کو ترقی یافتہ قرار دیا اور اس کو بطور سرکاری زبان لاگو کیا۔ یہ آباد زدہ لوگوں پر پہلا ثقافتی وار تھا، کیونکہ کسی معاشرہ کی زبان ہی اس کی اساس اور اکائی ہوتی ہے۔ زبان کی بنا پر ہی کسی علم کو اہمیت حاصل ہوتی ہے اور وہ علم قابل قبول ہوتا ہے۔

اسی طرح جب ایک زبان کو ہی ختم کر دیا جائے تو اس زبان سے منسلک تمام علوم خود بخود ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح آباد کاروں نے محکوم قوموں پر اپنی زبان لاگو کی اور اس کے ساتھ اپنے تعلیمی نظام کو بھی نافذ کیا۔ یہ سب انھوں نے اپنے نو آبادیاتی مقاصد کو پورا کرنے اور اس ملک کو مکمل طور پر اپنے قبضہ میں لینے کے لیے کیا۔

برطانوی راج سے باقی نو آباد زدہ لوگوں نے آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر بھی آزاد کر لیا، لیکن ہندوستان (پاک و ہند) اپنے آپ کو 1947ء میں آزاد کروانے کے بعد بھی محکوم ہی رہے اور آج تک اسی محکومی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور یہی دور مابعد نو آبادیات کہلاتا ہے۔ چونکہ ہندوستان میں انگریزوں نے بہت کافی عرصہ (1757ء-1857ء) تک جنگیں لڑی اور جس میں ہزاروں معصوم افراد کو قتل اور قید کیا گیا۔

اس سب دورانیہ میں انھوں نے طاقت کا استعمال کیا اور یہ طاقت بارود کی نہیں بلکہ حکمتِ عملی کی طاقت تھی۔ حکمتِ عملی کی اسی طاقت کی بدولت چند ہزار برطانوی سول ملازمین نے ہندوستان کی 30 کروڑ آبادی کو اپنے اشاروں پر نچا کے رکھ دیا۔ انگریز نے اپنی زبان، تعلیم اور ان حکمت عملیوں کی بدولت ہی اس وسیع سلطنت (برصغیر) کا انتظامی ڈھانچا اپنے ہاتھوں سے تشکیل دیا اور تسلط میں پوری طرح کامیاب ہو گئے۔ یہ سب انگریز کی چال اور ان کی پالیسی تھی جو ہمیشہ عوام سے مخفی رہی۔

اس حقیقت کی ایک کلاسیک مثال برطانوی مقالہ نگار اور ہندوستانی سپریم کونسل کے ممبر قانون لارڈ میکالے کی تعلیمی رپورٹ کا یہ حصہ ہے جس کا حوالہ اکثر دیا گیا ہے:

"فی الوقت ہماری بہترین کوششیں ایک ایسا طبقہ معرض وجود میں لانے کے لیے وقف ہونی چاہیں جو ہم میں اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین، جن پر ہم حکومت کر رہے ہیں، ترجمانی کا فریضہ سرانجام دے۔ یہ طبقہ ایسے افراد پر مشتمل ہو جو رنگ و نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو، لیکن ذوق، ذہن، اخلاق اور فہم و فراست کے اعتبار سے انگریز۔"[14]

نو آبادیات اصل میں اجارہ داری، ظلم و ستم اور جبر کا نام ہے اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ میں آباد کار کے ظلم و ستم، اجارہ داری اور جبر کی پیدا کردہ تدبیروں کو اور ان سے پیدا کردہ نتائج کا پردہ چاک کیا جاتا ہے۔ اسی طرح آباد کار نے اپنے سیاسی اور انتظامی امور خاص میں مقامی باشندوں کو اہمیت دینا بہتر نہ سمجھا اور اعلیٰ عہدوں پر ملازمت کے لیے کڑی سے کڑی شرائط کو نافذ کیا۔ انگریزی کو بطورِ سرکاری زبان نافذ کیا۔ اور سرکاری نوکری کے لیے انگریزی زبان کو ہی لازم قرار دیا۔ ان اصول و قوانین کے لاگو ہونے کے بعد انگریز حاکم اور ہندستانی غلام بن گیا۔

یوں اقتدار اور ایک وسیع سلطنت کی باگ سامراج کے ہاتھ میں آگئی اور اس میں انگریز کا کام آقا بن کر حکم دینا تھا اور مقامی لوگوں کا کام ایک بے نام جانور کی طرح، عزتِ نفس سے محروم ہو کر اپنے آقا کے حکم کی پیروی کرنا تھا۔ بر صغیر میں انگریز نے حکومت کرتے وقت مقامی حکمرانوں کو برقرار رکھا اور عوام کی نظر میں ان کی ہی حکومت کو سلام کیا لیکن یہ حکمران ان کے لیے ایک آلہ تھے جن کو آباد کار اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے رہے۔ یعنی مقامی حکمران ان کے لیے ایک مہرہ اور تاش کے پتوں کی مانند تھے جن کو وہ جب چاہتے اٹھا لیتے اور جب چاہتے پھینک دیتے۔

برطانوی حکومت جو علم اور اپنے معاشی نظام کی وجہ سے مہذب اور ترقی یافتہ قوم تھی اسی طاقت کی بنا وہ تقریباً دنیا کے ایک چوتھائی حصہ پر قابض رہی۔ اس نے نہ صرف انسانوں بلکہ زمین پر بھی اپنا جبری تسلط قائم رکھا اور خام مال کے ساتھ ساتھ استعمار زدہ لوگوں کو بھی غلام بنا کر ساتھ لے گئے۔ برطانوی سامراج کے پاس ہندوستان کی سرزمین کو نو آبادیات بنانے کی بہت سی وجوہات تھیں۔ مثلاً، زمین کی زرخیزی، معدنیات اور خام مال کی فراوانی، سمندری رستوں کی دستیابی، حکمرانوں کی آپس میں ناچاقی، ایک ہی ملک میں دو بڑے مذہب، غیر تربیت یافتہ فوج اور کثیر تعداد میں ان پڑھ عوام وغیرہ۔

یہ تمام ایسی وجوہات تھیں کہ جن کی بدولت برطانیہ نے اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے۔ برطانوی حکومت ہندوستان کے حکمرانوں کے شب و روز سے واقف تھی اور اس بات سے خوب آگاہی رکھتی تھی کہ وزراء اور امراء کو ان (آباد کاروں) کی سرگرمیوں سے کوئی سروکار نہیں۔ ہندوستانی سلاطین اپنی آرائش و زیبائش میں مگن رہے اور اس بات سے بے خبر رہے کہ ان کی عیاشی کے دن ختم ہونے والے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ برطانوی حکومت نے تن تنہا کیسے اس وسیع و عریض سلطنت پر اپنے قدم جما لیے اور اپنا انتظامی اور سیاسی نظام نافذ کیا؟ یہ ایک سیدھا سادا اور آسان سوال ہے، کیونکہ برطانوی حکومت نہ تو خلائی مخلوق تھی اور نہ ماورائی، بلکہ یہ ہم (ہندوستانیوں) لوگوں کی طرح دو ٹانگوں اور بازوؤں والے انسان تھے فرق صرف اتنا تھا، کہ ان کی چمڑی سفید تھی اور اس کے پیچھے وہ مکروہ سیاہ چہرہ اور شاطر کھوپڑی۔

ایک اجنبی جب ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے تو اس کو اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے کچھ معاون کرداروں کی ضرورت ہوتی ہے، یا اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ایک چور (آباد کار) ایک گھر میں (ہندوستان) چوری کرنا چاہتا ہے اور وہ (آباد کار) اس بات سے بے خبر ہے کہ اس گھر کے لوگ کیسے ہیں؟ کیا وہ اپنی حفاظت کرنا جانتے ہیں؟ اس گھر کا سربراہ (حکمران) کیسا ہے؟ کن کن جگہوں پر مال کو برآمد کیا جاسکتا ہے؟ وغیرہ۔ تو ان تمام سوالوں کے جواب وہ ہی دے سکتا

ہے جو اس گھر کا رہنے والا ہو، یعنی (گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے) اور پھر یا تو وہ اپنے گھر والوں سے متنفر ہو، یا چور سے آدھا حصہ لینے پر گھر کے بارے معلومات فراہم کر دے یا پھر عقل و شعور سے ہی بیگانہ ہو اور اسے فائدہ اور نقصان سے کوئی سروکار نہ ہو۔

کچھ ایسا ہی ہندوستان کی سرزمین کے ساتھ ہوا جس میں ہندوستان کے مقامی لوگ انگریز کے ساتھ مل گئے اور اس طرح ملک کی طاقت میں کمی آگئی ان معاون کرداروں کو انگریز کی طرف سے جائیدادملی۔ یوں وہ اپنے ملک کے لیے غدار اور انگریز کے لیے وفادار ثابت ہوئے۔ ان معاون کرداروں میں بہت سے ایسے افراد تھے جنھوں نے انگریزی طرزِ حکومت کو بہتر قرار دیا۔ نو آباد کاروں نے ایسی پالیسیاں بنائی جو بظاہر دنیا کے لیے تو ایک ترقی، نیکی، خیر اور بھلائی کا رستہ تھی لیکن عوام ان کے باطن سے بے خبر تھی کیونکہ وہ جس موڑ کو اپنے لیے ترقی سمجھ رہے تھے وہ ہی ان کے لیے باعث تنزلی تھی۔ یہ تنزلی بعد میں ان کے لیے ابدی بن گئی جس سے وہ آج تک نہیں نکل سکے۔ یہ سب انھوں نے علم کی بدولت کیا۔ اس علم کو انہوں نے بطورِ طاقت اور ہتھیار استعمال کیا۔ جیسے:

> ''خیال تو کرو، 35 کروڑ انسان اور ایک لاکھ سے بھی کم انگریز ان پر مزے سے حکومت کرتے ہیں۔ اور حکومت بھی کیسی حکومت! ہندوستان میں ذلیل سے ذلیل انگریز کا رتبہ بڑے سے بڑے ہندوستانی سے بڑھ کر ہے۔ یہاں انگلستان میں چاہے انگریز مرد ہمارے جوتے صاف کرے اور انگریز لڑکیاں ہم سے محبت کرے مگر سوئیز کے اس پار تو ہم سب کالا لوگ ''نیٹوز'' غلاموں سے بدتر سمجھے جاتے ہیں۔'' [15]

علم وہی ہے جس سے مخلوقِ خدا کو فائدہ اور آسانی میسر ہو، لیکن آباد کاروں نے اس بات سے انحراف کر کے علوم کو مادی اور افادی سطح پر استعمال کیا۔ اس علم کی تقسیم بھی انہوں نے اپنے من چاہے لوگوں میں کی۔ لیکن ذہین سے ذہین ہندوستانی کو بھی کمتر عہدہ دیا اور انگریز کو اعلیٰ سے اعلیٰ رتبوں پر فائز کیا۔ گویا علم کا بطورِ طاقت استعمال کرتے ہوئے، انھوں نے کالوں کو غلامی کے دلدل میں پھنسا دیا اور اس دلدل سے آج تک کالے (ہندوستانی) نہیں نکل سکے۔ کسی معاشرہ کی پہچان، اس کی زبان اور اس کی ثقافت سے کی جاتی ہے اور ثقافت ہی وہ اہم عنصر ہے جس کو مسخ کرتے ہوئے انگریز نے اپنی ثقافت کی نشوونما کی۔

مقامی لوگ (آباد زدہ) چونکہ انگریزوں کے لیے ایک پہیلی کی مانند تھے اور اس پہیلی پر گرفت حاصل کرنا ان کے لیے بہت ضروری تھا۔ یہ پہیلی ان کی ثقافت ہی تو تھی جس کا انگریز نے گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس خطے کی معاشرت، علم، سیاست، تاریخ، مذہبی عقائد و رسومات، جغرافیہ غرض زندگی کی ہر اکائی کے بارے میں خوب جانچ پڑتال کی اور پھر اس کے متبادل اپنی ثقافت کو پیش کیا۔ چونکہ انگریز کے آنے سے پہلے ہندو اور مسلمان دونوں میں مذہبی ہم آہنگی تھی۔ وہ دونوں مذہب، رنگ، نسل، زبان اور اپنے اپنے لباس سے بالاتر ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ انسانی برادری کے طور پر رہ رہے تھے لیکن انگریز نے اس ثقافتی اتحاد کو نشانہ بنایا اور دونوں کو یہ باور کروانے میں کامیاب ہوا کہ دونوں الگ الگ قومیں ہیں اور الگ الگ ثقافتی پہچان رکھتی ہیں۔

کسی بھی قوم کی ثقافت کو سمجھنے کے لیے اس کی زبان پر عبور حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ آباد کاروں نے بھی اس ثقافتی رکاوٹ کو عبور کرنے کے لیے ہندوستانیوں کی کلاسیکی اور ورنیکلرز بانیں سیکھی۔ ان پر تحقیق کی اور قواعد و لغات مرتب کیے اور اس طرح زبان کی طاقت کو اپنے استعمال میں لائے۔ سامراج کا مقصد طاقت ہی حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ وہ اس طاقت پر مکمل اجارہ داری چاہتے تھے۔ انگریز کو زبان سیکھنے کی ضرورت اس وقت پیش آئی 1615ء میں طامس رو تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا اور جہاں گیر کے دربار میں پیش ہوا۔ تب جلد ہی اسے اس بات کا بخوبی احساس ہوا کہ

اس کی زبان اس مقصد کے لیے ناکافی ہے۔ دربار کی زبان فارسی تھی، اور طامس رو فارسی نہیں جانتا تھا۔ لہذا اس نے اس مرحلے کو بھانپ لیا کہ آئندہ کی حکمتِ عملی یعنی فارسی زبان پر عبور کیے بغیر نوآبادیاتی منصوبہ چوپٹ ہو سکتا ہے اور ہندوستان ان کے لیے اجنبی اور ناقابلِ تسخیر ہی رہے گا۔

لہذا طامس رو کو جب یہ مسئلہ در پیش آیا تو اس نے کمپنی کو ایک خط لکھا کہ :

"ایک اور سخت تکلیف مجھے سہنی پڑی وہ ترجمان کی کمی تھی، کیونکہ دلال وہی کچھ کہیں گے جو انھیں پسند ہو گا، بلکہ وہ بادشاہ کے خطوط میں ترمیم کر دیں گے۔"[16]

زبان جو معاشرہ کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے اور ایک علامتی نظام ہے۔ آبادکاروں کے لیے زبان ایک بہت بڑی ثقافتی رکاوٹ تھی لہٰذا انھوں نے اس کو ختم کرنے کے لیے زبان پر عبور حاصل کیا۔ اسی طرح ثقافت کی مزید رکاوٹوں کو عبور کرنے کے لیے انھوں نے کچھ مقامی لوگوں کو بچولیا بنالیا اور انہیں عارضی طور دلال، پنڈت، اور وکیل جیسے خطابات سے نوازا تا کہ وہ ان کے ساتھ وفاداری کرتے ہوئے اپنی تہذیب و ثقافت سے سامراج کو مکمل طور پر آگاہ کرے۔

اس طرح کچھ مقامی لوگوں کی مدد اور کچھ اپنی مدد کے تحت انھوں نے یہ ثقافتی عبور کی اور اس طاقت کی بنا پر ہی انھوں نے ہندوستانیوں کے دماغوں اور نفسیات تک رسائی حاصل کی۔ اور ان کی تہذیب تک پہنچنے کے لیے ہندوستانی زبانوں کے انگریزی تراجم کروائے۔

گل کرسٹ ایک اہم نام ہے جس نے ترجمہ کاری کے لیے اپنی خدمات پیش کی۔ ترجمہ کاری کی وضاحت وہ کچھ اس طرح کرتا ہے کہ :

"میں نے ہر پیراگراف کا احتیاط سے جائزہ لیا، جانچا، اور اسے درست کیا، یہاں تک کہ ہم (گل کرسٹ اور ہندوستانی ونشی) نے وہ اصل ترجمہ حاصل کر لینے پر دو طرفہ اطمینان و محسوس کیا، جس کی اصل متن سے مطابقت اب ایک نئی آزمائش سے مشروط ہے۔ میں اس ترجمے کو لفظ بہ لفظ انگریزی میں ہندوستانی متن اصل ترتیب کے ساتھ پھر منتقل کرتا ہوں اور اگر تقسیم بذریعہ ضرب کے ثبوت کی طرح، یہ ترجمہ آزمائش پر پورا اترتا ہے تو میں مطمئن ہوں اور مجھے اسے اصل دستاویز کے کامل حقیقی عکس کے طور پر پیش کرنے میں عذر نہیں۔"[17]

زبان ہی آبادکاروں کے لیے ایک رکاوٹ تھی جس پر انہوں نے عبور حاصل کیا اور پھر اس زبان کو ترقی کے لیے ناکافی قرار دے دیا۔ انگریزی زبان کو سرکاری زبان قرار دیا اور سرکاری نوکری کے لیے اس کو لازم قرار دے دیا۔ ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ ہندوستانی قوم جو کہ ایک غیر تہذیب یافتہ اور جنگلی قوم ہے اس کو مہذب بنانے کے لیے انگریزی ہی ایک ایسی زبان ہے جو تہذیب کے دائرے میں آتی ہے۔ اس زبان کے لاگو کرنے کے بعد انہوں نے ہندوستان کے نظام تعلیم کو ناقص قرار دیا اور بہت سے تعلیم یافتہ لوگ انگریزی کی بدولت ان پڑھ ہو گئے۔ پھر یہ انگریزی تعلیم بھی صرف کلرک اور ماتحت ملازم ہی پیدا کر سکی۔ اور اعلی عہدوں پر انگریز ہی فائز رہا۔

زبان کا بدل جانا بھی ایک سماجی اجارہ داری ہے اور یہ ہی ایک قوم پر سب سے زیادہ نفسی تشدد ہوتا ہے جب اس کی زبان کو بدل کر اس کو ان پڑھ قرار دے دیا جائے اور یہ استحصال کی سب سے بڑی شکل ہے۔ اس سے مقامی لوگوں کی ثقافتی شناخت اور ان کا ماضی ختم ہو جاتا ہے۔ پہلے سے موجود علم ناقص اور ضائع ہو جاتا ہے۔ یوں ایک معاشرے کو شدید ذہنی دھچکا لگتا ہے اور وہ نفسیاتی طور پر بیمار ہو جاتا ہے۔ یوں اس کی قومی شناخت بھی محرومی اور پسپائی کا شکار ہو جاتی ہے۔

مابعد نوآبادیات کے اثرات کا ایک تنقیدی جائزہ لیں تو یہ بالکل واضح ہے کہ نوآبادیاتی نظام حکومت نے محکوم

لوگوں کو ذہنی غلام بنادیا۔ ان کی ثقافت، مذہب، اور ان کی تعلیم پر وار کر کے ان سے سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت کو سلب کر لیا۔ جائیداد کی ایسی غیر منصفانہ تقسیم کی کہ اس کے آج بھی اثرات نظر آتے ہیں۔ امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا جارہا ہے۔ برانڈز اور ورائٹی کے پیچھے عوام بھاگ رہی ہے اور اپنی احساس کمتری کو اس انداز سے ختم کرنا چاہتی ہے۔ مادیت پرستی کا دور دورہ ہے۔ رشتوں سے زیادہ پیسہ کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اور یہ سب نوآبادیاتی نظام کا ہی کیا دھرا ہے۔ آج انگریزی تعلیم کو باعث فخر سمجھا جاتا ہے۔ نوآبادیاتی نظام پر ہی آج کا جاگیردار عمل کر رہا ہے اور اپنے ملازموں سے وہی ناروا سلوک کرتا ہے جو انگریز نے مقامی لوگوں کے ساتھ کیا۔ اپنی ثقافت کو وہ باعثِ نفرت سمجھتا ہے۔

اپنی تعلیمات اور زبان سے آج کا انسان بھاگتا ہے کیونکہ وہ خود کو مہذب اور ترقی یافتہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اپنی مادری زبان جو پہلے قابلِ فخر سمجھی جاتی تھی آج اس سے انسان شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ جو شخص انگریزی کے دو چار لفظ سیکھ جائے اس کا وقار معاشرہ میں بڑھ جاتا ہے۔ نوآبادیاتی تعلیم کے زیرِ اثر ماں باپ نے بھی خود کو اس احساس کمتری میں مبتلا کر لیا ہے اپنے بچوں کو وہ فاسٹ فوڈ کی طرف راغب کرتے ہیں اور دیسی چیزیں (لسی، دہی شربت وغیرہ) اپنے بچوں کے دوستوں کو پیش کرنے سے اجتناب کرتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہ غذائیں غیر ترقی یافتہ اور غیر مہذب لوگوں کی ہے۔ اسی نوآبادیاتی نظام کے زیرِ اثر انسان ہیلو، ہائے کرنے میں فخر اور سلام کہنے میں اپنی بے توقیری محسوس کرتا ہے۔

اسی نظام کے تحت حکومت یا سرکاری اداروں میں بھی اب انگریزی نظامِ تعلیم کو اہمیت دی جاتی ہے اور آج بھی قوم اسی احساسِ کمتری کا شکار ہے جس میں آباد کاروں نے ان کو مبتلا کیا اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی بھی برطانوی سامراج ہی حکومت کر رہا ہے۔ ہم ان کے جبر اور ان کی اطاعت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمارا اپنا نفس مردہ ہو چکا ہے ہماری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے۔ ایک آزاد قوم ہوتے ہوئے آج بھی ہم غلام ہی ہیں اور اپنی آزادیِ رائے سے محروم ہیں۔ یہ سب نوآبادیاتی نظام کا اثر ہے۔

حوالہ جات

1۔ ناصر عباس نیر، مابعد نوآبادیات اردو ادب کے تناظر میں، کراچی، اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2013ء، ص: 10
2۔ اقبال نزاکت، لندن کی ایک رات کا نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی مطالعہ، اسلام آباد، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، جنوری 2019ء، ص: 5
3۔ اقبال نزاکت، متذکرہ بالا، ص: 7
4۔ ناصر عباس نیر، متذکرہ بالا، ص: 4
5۔ اقبال نزاکت، متذکرہ بالا، ص: 9
6۔ عارف ثاقب، انجمن پنجاب کے مشاعرے، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، 1995ء، ص: 313
7۔ اقبال نزاکت، متذکرہ بالا، ص: 11
8۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو (پاکستان)، ص: 239
9۔ The world book of encyclopaedia, USA, 1998, Page: 814
10۔ Robert, JC. Young, an introduction to post, colonialism, Page: 17
11۔ سر سید احمد خان، مقالاتِ سر سید، جلد سیز دہم، لاہور، مجلس ترقی ادب، 1963ء، ص: 575
12۔ نیر، ناصر عباس، متذکرہ بالا، ص: 6
13۔ ایڈورڈ سعید، Culture and imperialism، ونٹاز، انگلینڈ، 1994ء، ص: 6
14۔ نیر، ناصر عباس، متذکرہ بالا، ص: 12
15۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، ص: 73
16۔ نیر۔ ناصر عباس، متذکرہ بالا، ص: 81
17۔ Jargon ۔it 's the anti، کلکتہ، 1800ء، ص: 247

منیر احمد فردوس

احمد بشیر کے ناول ''دل بھٹکے گا'' میں بٹوارے کی اخلاقیات

سادہ سی بات ہے کہ اگر کسی عہد کو تمام تر سچائیوں کے ساتھ محفوظ کرنا مقصود ہو تو سوانحی ناول لکھ لیا جائے بشر طیکہ ناول نگار میں اتنا حوصلہ ہو کہ وہ خود کو بھی سچ کی عدالت میں پیش کر سکے۔ کیونکہ سچ کا مقدمہ اس کی اپنی ذات سے شروع ہو کر سماج کے مختلف حصوں تک پھیلتا ہوا طوالت اختیار کر لیتا ہے اور وقت استغاثہ کا کامیاب وکیل بن کر ناول نگار سے ایسے چبھتے ہوئے سوالات کرتا ہے کہ وہ ملمع کاری یا مصلحت سازی کے رنگ برنگے پردوں میں جتنا بھی چھپنا چاہے نہیں چھپ سکتا، سبھی پردے لیر و لیر ہو جاتے ہیں اور اندر سے ناول نگار کا سچا، کھرا اور اصل روپ جھانکنے لگتا ہے جسے دیکھ کر دنیا زادے ہکا بکا رہ جاتے ہیں۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کہ اگر کوئی مصنف اپنا انفرادی سچ لکھنے کی جرأت کر سکتا ہے تو وہ معاشرے کا اجتماعی سچ لکھنے کا بھی پورا پورا استحقاق رکھتا ہے۔ سچ کے اس فارمولے کو پیمانہ تسلیم کرتے ہوئے اگر اردو ادب کا دامن کھنگالا جائے تو بہ مشکل گنتی کے چند ہی سوانحی ناول اس کے بطن سے برآمد ہوں گے، جن میں ''دل بھٹکے گا'' جیسا ناقابل ش ناول بھی بڑی شان کے ساتھ ان میں شامل ہو گا۔

''دل بھٹکے گا'' ناول کے خالق اور لاہور کے صحافتی ایوانوں میں ہلچل مچا دینے والے معروف صحافی، کالم نگار، ادیب، ناول نگار اور خاکہ نگار احمد بشیر سچ کے ایسے علم بردار بن کر سامنے آئے کہ جنھوں نے نہ خود کو بخشا اور نہ ہی کوئی رعایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ''جیسے ہو ویسے دکھو'' کو کسوٹی جان کر انھوں نے قلم پکڑا اور سچ کی اجلی روشنائی سے اپنی ذات کی دھجیاں اڑاتے ہوئے معاشرے سے بھی اس کا نقاب چھین کر ناول میں اس کے کئی چہرے تجسیم کر ڈالے۔

احمد بشیر کا شاندار سوانحی ناول ''دل بھٹکے گا'' قاری کو پورا سماج گھماتے پھراتے ہوئے ایک ایسی بند گلی میں پہنچا دیتا ہے جہاں سے اسے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ یا تو وہ سچ کو تمام تر کڑواہٹوں کے ساتھ اپنا کر خود کو امر کر لیتا ہے یا کلی طور پر رد کر کے اپنی قبر اسی بند گلی میں کھود لیتا ہے۔ تیسرا کوئی راستہ اس کے پاس نہیں بچتا۔ زبان و بیان کے حوالے سے یہ ناول اتنا زرخیز ہے کہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ صحافت کو اوڑھنا بچھونا بنانے والے ایک صحافی کی زبان چاشنی سے بھرپور اور اتنی ادبی بھی ہو سکتی ہے۔

احمد بشیر خود ناول میں جمال کا مرکزی کردار اوڑھ کر اپنی زندگی کے شب و روز سے پردے ہٹاتے ہوئے قاری کو ایک ایسے طلسم کدے میں لے چلتے ہیں جہاں دل ماننے کو تیار نہیں ہوتا کہ انھوں نے ایسی بھرپور، مہماتی، کھلنڈری اور دلیرانہ زندگی جی ہے۔ خاص طور سے بٹوارے کے فسادات میں ان کا کردار حیران کن حد تک قاری کو ششدر کر دیتا ہے۔

ناول کا سب سے اہم پہلو بھی تقسیم ہند کے وہ خونی دنگے ہیں جو احمد بشیر کے جادوئی قلم سے قاری کو اپنے اندر سے اٹھا کر اسی فسادی دور میں لا کھڑا کرتے ہیں جہاں قاری سارا خون خرابہ اور لوگوں کی حیران کن طور پر بدلتی وحشیانہ اخلاقیات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے لگتا ہے جبکہ فسادات کا نقشہ کھینچتے ہوئے ان کا قلم اپنے فن کی جولانیوں پر جا پہنچتا ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے پس منظر میں نمودار ہونے والے بلووں کی روداد بیان کرتے ہوئے احمد بشیر صحافی سے ادیب کا روپ دھار کر ایک ایسے منجھے ہوئے کہانی کار بن جاتے ہیں کہ دنگوں پر مشتمل ایسے جان کاہ واقعات قاری کو کہیں اور پڑھنے کو نہیں ملتے۔ وہ ان فسادات کے چشم دید گواہ بھی ہیں جسے انہوں نے ایک نئے زاویے سے مہابیانیہ کے ساتھ بیان کر کے اپنا ایک نقطۂ نظر بھی واضح کیا ہے۔

بڑا حادثہ ہمیشہ بڑا ادب تخلیق کرتا ہے۔ اس بات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو موضوعاتی سطح پر ابھی تک اردو ادب میں تقسیم ہی وہ واحد موضوع ہے جس نے بڑا ادب پیدا کیا ہے۔ منٹو کے افسانے اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ آگ کا دریا، آنگن، پنجر، تمس (ہندی ناول)، اداس نسلیں، شہاب نامہ، الکھ نگری وغیرہ جیسے بڑے ناولوں کی داستانوں میں اتر جایئے، جہاں تقسیم کے فسادات کی بازگشت عام سنائی دیتی ہے۔ "دل بھٹکے گا" میں بھی بٹوارے کے خونی شب و روز ناول کا سب سے اہم حوالہ ہیں اور یہ حوالہ اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ موجود ہے جس میں کسی قسم کی کوئی طرف داری، ناانصافی یا جذباتی پن نہیں برتا گیا بلکہ احمد بشیر صرف اور صرف سچ کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔

یہ مشاہدہ عام ہے کہ تقسیم کے موضوع پر لکھے گئے دونوں اطراف کے افسانے، ناول، کہانیاں اور خاص طور سے بنائی گئی فلمیں اکثر جانب داری کا شکار ہو کر تعصبانہ رویے کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں جس سے اس وقت کی صورتِ حال کو صحیح معنوں میں سمجھنے میں مشکلات درپیش ہوتی ہیں بلکہ یہ رویہ ایک لحاظ سے تاریخی بددیانتی کے زمرے میں بھی آتا ہے مگر احمد بشیر کا ناول اس رویے سے مکمل طور پر پاک صاف ہے جس میں سماجی، نفسیاتی اور انسانی اخلاقیات اپنی تمام تر خوبصورتیوں اور سچائیوں کے ساتھ موجود ہیں۔

خاص طور سے دنگوں کے ماحول میں جب لوگوں نے اپنی اخلاقیات بدلنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی اور وہ انسانیت سوز سلوک کے مرتکب ہو کر درندگیوں پر اتر آئے۔ مشکلات میں گھرے ہوئے اپنے جانے پہچانے لوگوں کے لیے وہ ایک دم سے غیر بن گئے۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے کے لئے دعاؤں میں اٹھنے والے ہاتھ تلواریں، نیزے، بھالے، بلم، کرپانیں اور بندوقیں اٹھا کر اپنی قاتلانہ اخلاقیات کا کھلم کھلا اظہار کرنے لگ جائیں۔

پڑوسیوں کے سر دپڑتے چولہوں پر ترس کھانے والے آخر کیسے ایک دوسرے کو آگ میں جھونکنے کے درپے ہو گئے؟ بھوکے پیٹ پڑوسی کے لئے تڑپ جانے والے ایک دوسرے کا مال کیوں کر لوٹنے پر آمادہ ہو گئے؟ یقیناً یہ ان دنگوں کی ہی ودیعت کردہ اخلاقیات تھیں کہ گود میں پلنے والے معصوموں کو کاٹتے وقت کسی کے ہاتھ تک نہیں کانپے۔ یہاں تک کہ محلے کی ننگے سر گھومتی لڑکیوں کو اپنی بہو بیٹی سمجھ کر دوپٹہ اوڑھنے کی تلقین کرنے والے سرِ عام ان کی عزتیں تار تار کر کے اپنی مردانگی کا ڈھنڈورا پیٹنے میں لگے رہے۔

یہ تقسیم کی وہ ظالمانہ اخلاقیات تھیں جسے اپنانے میں کسی نے بھی تردد نہ کیا۔ کسی نے سوچا تک بھی نہیں کہ ہم کر کیا رہے ہیں اور کل کو تاریخ ہمیں کٹہرے میں کھڑا کر کے چبھتے ہوئے سوالات بھی کر سکتی ہے۔ کڑوی حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سب معاشرے کے وہ عام لوگ تھے جنھیں اندھیروں میں رکھ کر آس پاس کے خاص لوگ ان سے اپنے ایجنڈے پر کام کروا رہے تھے۔ (اس بات کا تذکرہ محمد عاصم بٹ نے بھیشم ساہنی کے ہندی ناول "تمس" پر لکھے گئے اپنے ایک مضمون میں بھی کیا ہے)۔

یعنی ایک ایسا ماحول جب ہر طرف قتل وغارت کا وحشیانہ موسم اترا ہو، لوٹ مار کے بازار گرم ہوں، چیخ وپکار کی سرخ آندھیاں چل رہی ہوں، ہتھ جوڑے روتے بلکتے اور جان کی بخشش مانگتے مظلوم لوگ ہوں، دھواں دھواں گلیاں، محلے اور محلے داروں کو آگ کے بھڑکتے شعلوں کا لباس پہنا دیا گیا ہو، لٹے پٹے لوگوں کے قافلے ہوں، جگہ جگہ چیرے پھاڑے ہوئے انسانی وجود پڑے ہوں۔ ایسی درندگی میں اگر فسادیوں کی درندہ صفت اخلاقیات ہی ان کی پہچان بن گئی ہو تو ایسے ماحول میں وہاں اپنا ایک الگ راستہ چنتے ہوئے رنگ ونسل، زبان اور مذہب سے ماورا ہو کر ظلم کی آگ میں جلتے ہوئے مظلوموں کو بچانا یقیناً ایک نئی اخلاقیات کا نہایت خوبصورت اظہار یہ تھا، سچ کو زندہ رکھنا تھا اور سچ کا یہی فلسفہ ہی ''دل بھٹکے گا'' کی اساس ٹھہرتا ہے جو اسے دوسرے ناولوں سے ایک الگ حیثیت دیتا ہے کہ جس میں کسی قسم کا کوئی تعصب نہیں برتا گیا اور نہ ہی کہیں کوئی جانب داری دکھا کر اپنی برادری کے لئے کوئی نرم گوشہ پیدا کیا گیا ہے۔

یہ ناول نہیں، ایک سچا صحیفہ ہے جس میں ہتھیار اٹھانے والے وحشیوں کو ظالم کا لقب دیا گیا، لوٹ مار کرنے والوں کو لٹیرا کہا گیا ہے، انسانی وجود سے سانسیں نچوڑنے والوں کو قاتل کہا گیا، نہ اپنا دیکھا گیا نہ غیر، بس ظالم ظالم ٹھہرا اور مظلوم مظلوم، چاہے وہ کوئی بھی ہو، کہیں سے بھی ہو۔

عام طور پر ایسے جلتے ہوئے اور جان لیوا ماحول میں ہر کسی کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوتے ہیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک جاتے ہیں مگر احمد بشیر (جمال) نے مظلوموں پر ایسا ظلم کر کے انھیں موت کے کنویں میں نہیں دھکیل دیا۔ یہ ان کے اندر کی اخلاقیات کے منافی تھا۔ یہ رویہ انسانیت کے خلاف تھا کہ باہر بھوکے پیاسے بوڑھے، مرد، جوان، بچے، عورتیں ننگے سر ننگے پاؤں اپنے معصوموں کو کلیجوں سے لگائے ہلدی چہرہ لیے جانیں بچاتے ادھر ادھر چھپتے پھر رہے ہوں اور وہ اندر سے کنڈی چڑھائے دروازہ بند کیے دنگوں کے ختم ہونے کے انتظار میں ہوں۔ یہی وہ نکتہ ہے جو اس ناول کو اور ناول نگار کو بلندیاں عطا کرتا ہے بلکہ کئی موقعوں پر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جہاں احمد بشیر نے معصوموں اور مظلوموں کو بچایا وہاں ظالموں کو بھی شرم دلائی۔ ''دل بھٹکے گا'' کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

''بھٹی نے چادر میں سے ایک تلوار نکالی، اس کی دھار پر دندانے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا :

''بے ایمانی عام ہو گئی ہے جی۔ ابھی پرسوں میں نے یہ بیس روپے میں خریدی تھی مگر ایک ہی کام میں بیکار ہو گئی۔ کچا لوہا تھا اس کا، خدا کا خوف نہیں رہا جی کسی کو؟''

تلوار پر جمی چربی دیکھ کر جمال ڈر گیا۔

''کیسی چربی ہے یہ؟'' جمال نے پوچھا

''رات کی بات کر رہا ہوں سرکار، جب آپ کا تانگہ گزرا تو ہم تینوں وہیں کھڑے تھے جھاڑیوں میں مگر آپ تو رکے ہی نہیں، ہمارا حال بھی نہ پوچھا۔''

''تو لالہ مایارام کو تم نے قتل کیا؟'' جمال نے پوچھا

''میں اکیلا کہاں تھا جی۔ شیخ اور بوبا قصائی بھی ساتھ تھے میرے۔ مایارام کو میں نے تکبیر پھیری۔ شیخ نے اس کے بھائی کے سینے میں برچھی ماری۔ بوبے قصائی کا شکار چھوٹا تھا مگر اس سے لڑکی کی گردن کٹتی ہی نہ تھی، نرم بہت تھی جی، اسے کافی دیر لگی۔''

''بھٹی پہلوان تمہیں کوئی پشیمانی نہیں کہ تم نے ظلم کیا؟'' جمال نے پوچھا

''بڑی پشیمانی ہو رہی ہے جی اور بے بے نے رات کو جوتیاں مار کر مجھے گھر سے نکال بھی دیا تھا۔''

ناول کا یہ وہ حصہ ہے جو قاری کو گنگ کر دیتا ہے اور ان چہروں پر ایک زوردار طمانچہ بھی ہے جو اس وقت کے خونی کھیل میں اندھے ہو کر کود پڑے تھے۔ ایسے کٹھن حالات میں ''دل بھٹکے گا'' ایک الگ فلسفۂ اخلاقیات کا راستہ دکھاتا ہے کہ زندگی میں جب کبھی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ انسانی سماج میں چھپے جنگلی درندے اپنی تمام تر درندگیوں کے ساتھ نہتی انسانیت پر جھپٹ پڑیں تو اس وقت ایک انسان کو کیا کرنا چاہیے اور کس کی طرف داری کرنی چاہیے؟

احمد بشیر کے فلسفے کے مطابق ہر ظالم غیر ہوتا ہے اور ہر مظلوم اپنا ہوتا ہے، چاہے اس کا رنگ، زبان، مذہب اور علاقہ کوئی بھی ہو کیونکہ ظالم کبھی حق پر نہیں ہوتا اور مظلوم کبھی غلط نہیں ہوتا۔ اسی فلسفے کی ایک مثال اس ایک واقعہ میں بھی ملتی ہے جو ناول کا سب سے متاثر کن اور تکلیف دہ باب ہے کہ جب چار سالہ ننھی کرشنا درندوں میں گھری ہوتی ہے، جسے جمال (احمد بشیر) اور اس کے ساتھیوں نے اپنی جان پر کھیل کر بچایا۔ کرشنا کے بارے میں درج ہے کہ:

> ''اختر، جمال اور مشتاق کو پتہ ہی نہ تھا کہ کرشنا ان کے سامنے کھڑی ہے۔ وہ چار سال کی بچی خالی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے سر پر چھوٹی چھوٹی مینڈھیاں گندھی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے کا رنگ کاغذ کی طرح سفید تھا۔ وہ پیروں سے ننگی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر لگتا تھا وہ سوئی ہوئی ہے یا اس کے سامنے اندھیرا ہے جس میں اسے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اسے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ میں یہاں کیوں کھڑی ہوں۔ مشتاق نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ پھر اچانک اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ کرشنا کی پیٹھ میں ایک چھرا کھبا ہوا ہے اور جمے ہوئے خون سے اس کا فراک کیچڑ ہو رہا ہے۔ اختر نے چھرا کھینچ کر نکالا تو زخم سے تازہ اور گرم خون کی دھار پھوٹ پڑی۔ کرشنا چپ رہی جیسے اسے درد کا احساس ہی نہ ہو۔ اختر نے چھرا دور پھینک دیا اور تینوں کرشنا کو لے کر چوبارے کی طرف چلے۔ اچانک ایک مردے نے جمال کی ٹانگ پکڑ لی۔ تیس پینتیس سال کی اس زخمی عورت کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ حالانکہ اس کے کولہے کے زخم سے چربی نکل رہی تھی اور اس کے گال پر جما ہوا خون کالا ہو چکا تھا۔ جمال نے اسے اٹھایا اور کندھے پر ڈال کر ساتھ لے چلا۔''

''دل بھٹکے گا'' میں اس طرح کے بے شمار واقعات ملتے ہیں جب احمد بشیر نے خطروں کو پس پشت ڈالتے ہوئے فسادیوں کے جتھوں میں سے مظلوموں کی جانیں بچائیں۔ ممتاز مفتی کی بہن کو کرشن نگر سے نکال کر لے آنا، دنگے میں گھرے مشتاق اور اس کی بیوی کو تن تنہا بچانا، کسی گھر پر ناجائز قبضہ نہ کرنا، لوٹ مار میں شامل نہ ہونا بلکہ ممتاز مفتی کو الاٹ ہونے والے گھر کا سارا سامان پڑوسیوں کو اٹھا کر دے دینا۔ ہر قسم کے کٹھن حالات میں وہ اپنی اخلاقیات نہیں بھولے اور نہ ہی کسی خونی منظر سے متاثر ہو کر جذباتی ہوئے۔ بلکہ انھوں نے وہی کچھ کیا جو قدرت کی اخلاقیات کے اصولوں میں شامل تھا۔ حالانکہ سرحد پار سے مظلوموں کی سر بریدہ لاشوں سے بھری ٹرینیں اس طرف پہنچ رہی تھیں مگر اتنا کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود وہ جذبات کے اندھے کنویں میں نہیں گرے بلکہ اپنے اخلاقیاتی فلسفے پر قائم رہے۔

یہ اخلاقیات کا وہ پیمانہ ہے جسے ایک تحریک کے طور پر اپنانے کے لیے اگر دونوں اطراف کے ذمہ داران سر جوڑ کر بیٹھ جاتے تو یقیناً ان دنگے فسادوں میں جانی، مالی، کپڑا لتا، جائیداد، معصوم بچوں اور عزتوں کا نقصان کم سے کم ہوتا اور برصغیر کی تقسیم اتنی خون آشام نہ ہوتی۔ یہ بات اپنی جگہ درست کہ دوسری طرف سے بھی انفرادی سطح پر ایسی اخلاقیات ضرور اپنائی گئی ہوں گی مگر مجموعی تاثر جو ملتا ہے اس سے بٹوارے کی اخلاقیات وحشیانہ ہی محسوس ہوتی ہے اور تاریخ یہی بتاتی ہے کہ بہتی گنگا میں ہر کسی نے خوب ہاتھ دھوئے۔ یہ حقیقت بھی تسلیم کرنا پڑے گی کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی ہجرت تھی، جس میں نقصان بھی اتنا ہی زیادہ ہوا کہ سرحد کے دونوں طرف کے لاکھوں خاندان بیٹھے بٹھائے

لٹ گئے اور اتنا خون بہایا گیا کہ تاریخ بھی جس کا حساب دینے سے قاصر ہے جبکہ اس کے ذمہ داروں کو تاریخ کے کٹہرے میں ابھی کھڑا ہونا ہے۔

''دل بھٹکے گا''، بہت سارے معاملات اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ یہ تقسیمِ ہند کی ایک جیتی جاگتی اور سچی کھری دستاویز بھی ہے۔ اگر ادبی اور تخلیقی حوالے سے بات کریں تو جہاں احمد بشیر نے ناول میں نئی اخلاقیات وضع کی ہیں وہاں انھوں نے فسادات کا آنکھوں دیکھا حال ایسے دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے کہ لہو رنگ واقعات کی جزئیات نگاری، منظر نگاری، مکالمہ بازی، کردار نگاری اور جذبات نگاری کے حوالے سے انھوں نے بیسیوں ادیبوں کو مات دی ہے۔

بلووں کا انہوں نے ایسا دلگیر اور حقیقی نقشہ کھینچا ہے کہ قاری قدم قدم پر اپنی سانسوں کے اتار چڑھاؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے فسادیوں کے ہاتھوں زخمی ہونے والی ماسٹر کی بیوی اور ننھی کرشنا کا جو حال انہوں نے بیان کیا ہے اس سے قاری کے اندر ہمدردی کی کتنی ہی کونپلیں کھل اٹھتی ہیں۔ کرشنا اور اس کی سہیلی فرتو دونوں ناول کے سب سے معصوم اور خوبصورت ترین کردار ہیں۔ فرتو جو زخمی کرشنا کو اپنی بہن بنا کر اپنے ساتھ سلاتی تھی اور دن رات اس کے ساتھ چپکی رہتی تھی۔

اس واقعہ کا سب سے دلچسپ اور خوبصورت ترین پہلو یہ ہے کہ جب جمال اور مشتاق بھیس بدل کر آس پاس کے گاؤں قصبوں میں جا کر ننھی کرشنا کی ماں کو تلاش کرتے ہیں اور یہ ان کے فلسفہ اخلاقیات کا سب سے اعلیٰ اظہار ہے۔ فرتو کا کردار تو ابھی بھی اپنی حیاتی جی رہا ہے مگر کرشنا کا کوئی اتا پتہ نہیں، شاید وہ بھی سرحد پار کہیں سانسوں کی اجرت کما رہی ہو۔

''دل بھٹکے گا''، دراصل کئی زمانوں کی انمٹ داستانوں پر محیط ایک ایسا ناول ہے جسے اردو ادب کے بڑے ناولوں کے ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ احمد بشیر خود ہی اس ناول کے مرکزی کردار ہیں جو گھر بیٹھے قاری کو اس داستان کے مرکز کے ساتھ جوڑ کر اسے عجیب سے جہانوں کی کڑوی کسیلی، میٹھی اور دلچسپ یادوں سے مالا مال کر دیتے ہیں۔ بس ایک بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ ممتاز مفتی جیسے جہاں دیدہ ادیب، جنہوں نے احمد بشیر کے ساتھ زندگی گزار دی، مگر وہ ان کے اندر کے ادیب کو پوری طرح سے پروان نہ چڑھا سکے اور انھیں صحافت کی کٹھن بھول بھلیوں کی طرف جاتے ہوئے چُپ چاپ دیکھتے رہے۔

سید محمد زاہد

بن بیاہی بیوہ اور معلق بوسہ

''مشری مورہ! وہ بہت غمگیں ہے۔ اپنے ہاتھوں کے کاسہ میں منہ چھپائے، سر جھکائے بیٹھی ہے۔ کسی بات پر دھیان ہی نہیں دے رہی، بس خلاؤں میں گھور رہی ہے۔ اس غریب، ناچار کو دیکھ کر دل میں خوف جاگ اٹھتا ہے۔ کل صبح بات ختم ہو جائے گی۔ میری بھرپور کوشش کے باوجود وہ کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ وہ اپنی غلطی پر شرمندہ بھی نہیں۔ میں اسے تلاوت کے لیے قرآن پاک دے آئی ہوں کہ اپنے گناہوں کی توبہ کر لے۔ سب بے سود ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اس کا ان باتوں پر ایمان ہی نہیں۔ کہیں وہ کافر تو نہیں؟ مجھے تو وہ روسی ہی لگتی ہے؟''

''مشری مورہ! ہم اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ حسرت و یاس کی اس گھڑی میں اسے خوش کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ میں نے رقاصہ سے اس کی زندگی کے بارے میں جاننے کی کوشش کی، وہ کچھ نہیں بولتی۔ صرف خلا میں گھورے جاتی ہے۔ اسے دیکھ کر لحہ لحہ میرے دل کی بے کلی بڑھتی جا رہی ہے۔ کیا موت سے پہلے اس کو پل بھر کی خوشی بھی مہیا نہیں کی جا سکتی؟''

''زما مورہ! ایسی خوبصورت لڑکی کی موت کے بارے میں سوچتی ہوں تو ہول اٹھتا ہے۔ یہ حسن، یہ بھرپور جوانی، گولیوں کا نشانہ بننے کے لیے ہے!''

بڑی بہن نے گفتگو ختم کر کے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر سینے پر باندھ لیے۔ وہ بھوری نمناک آنکھوں سے اپنے سامنے موجود جھریوں بھرے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ چاندی گھلے بالوں والی بوڑھی اماں کا متفکر چہرہ کافی پیلا پڑ چکا تھا۔ ضعیف، خمیدہ تن، نحیف و نزار اماں بھاری بھر کم چغہ اوڑھے خاموش کھڑی تھی۔ رقاصہ پر غداری اور بے حیائی کے الزامات تھے۔ اس کا تعلق وسطی ایشیا کے کسی جنگجو قبیلے یا خانہ بدوش قوم سے تھا۔ طالبان نے پغمان سے پکڑا تھا۔

صدارتی محلات پر حملے میں سینکڑوں لاشوں کے بدلے انھیں یہ نرم و نازک سی لڑکی ملی تھی۔ امریکیوں کی ترجمانی اور محفلوں میں ڈانس کرنے کے جرم میں اسے یہ سزا دی گئی تھی۔ طالبان پہاڑوں کی طرف جاتے جاتے، اس قلعہ نما گھر میں، ان کے حوالے کر گئے تھے۔ ایسی کمزور عورت کو گولی مار کر اڑا دیا جائے گا، اس خیال سے سر سے پاؤں تک لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ اس خانہ جنگی نے انسانوں کو وحشی بنا دیا تھا۔

حلیم بھوری آنکھوں سے بڑی بیٹی کو دیکھتے ہوئے ماں کہنے لگی:

''میری بچی! میں دیکھتی ہوں، مجھے اس کے پاس لے چلو۔'' لمبی راہداریوں سے گزرتے وہ وہاں پہنچی۔

کوہ قاف کی پری، رقاصہ اپنے بستر پر بیٹھی تھی۔ جلد کی رنگت سفید پڑ چکی تھی لیکن اس کے نیچے بہتے خون میں زعفران کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ گول کتابی چہرے پر بھویں کمان کی طرح اوپر اٹھی ہوئیں تھیں۔ پرکشش لب خاموش سے جھانکتے دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ سیدھی مانگ سے نکلتے ہوئے کالے بالوں نے ماتھے کے کناروں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ دونوں بازو سینے کے نیچے لپیٹے تھے گویا نرم و نازک کومل جسم میں سلگتے الاؤ کو بھڑکنے سے

روک رہی ہے۔ پنجرے میں بند چیتے کی طرح، بغاوت کے ڈوروں سے دمکتی سرکش شرابی آنکھیں، آنے والی عورتوں کے جسم کو چیرتی، مٹی کی دیواروں کے پار دیکھ رہی تھیں۔

''ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں؟'' بوڑھی اماں نے پوچھا۔

رقاصہ نے لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے کندھے اچکائے۔ ریشمی پیراہن کے نیچے اس کے کومل بدن کی پھڑپھڑاہٹ واضح نظر آ رہی تھی۔

''زمالور! تم بہت غمگیں ہو، مجھے بتایا گیا ہے کہ تم عبادت بھی نہیں کر رہی ہو۔ دعا بھی نہیں مانگ رہی۔ یہ تکلیف دہ رویہ ہے۔''

رقاصہ کے ہونٹوں پر پر لطف مسکراہٹ بکھر گئی۔ ایسا لطف جو میٹھے پھل میں، سریلی دھن میں یا معشوق کے طویل بوسے میں ہی مل سکتا ہے۔ پھر اس نے عدم آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے سر کو جھٹک دیا۔

''میری بیٹی، یہاں کوئی بھی ایسی بات نہیں کرے گا جو تمہیں دکھ دے۔ سب کو تمہاری تکلیف کا احساس ہے۔ ہر کوئی سمجھتا ہے۔ کیا تم کوئی کتاب پڑھنا چاہو گی؟ تم شراب پسند کرتی ہو تو ہم اس کا بھی بندوبست کر دیں گے۔ کوئی ایسا کام جس سے کچھ دیر کے لیے ہی سہی اس آفت سے تمہارا دھیان بٹ جائے؟''

رقاصہ نے اپنے ہاتھ کھول دیے۔ پھر انھیں گردن کے پیچھے رکھ کر ایک ادا سے سر کر ہلایا۔ اس عمل میں ایک خوبصورتی تھی، ایک لچک تھی۔ اس سرو قامت موہنی رقاصہ کا پورا بدن خوبصورت تھا۔ انگ انگ سے سندرتا پھوٹتی تھی۔ سندر لیلا دیکھ کر بڑی ماں کے پژمردہ چہرے پر بھی ہلکی سی سرخی بکھر گئی۔

''میری پیاری بیٹی! کیا تو ہمارے لیے رقص کرے گی؟''

رقاصہ نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے گویا کوئی بچی نماز میں قیام کے لیے کھڑی ہو۔ یاقوتی ہونٹوں پر دوبارہ پر لطف مسکراہٹ بکھر گئی، وہی مسکراہٹ جو میٹھی شراب کا مزہ چکھنے کے بعد نظر آتی ہے۔ لیکن اب کی بار وہ عارضی نہیں تھی۔

''ہاں،'' وہ کہنے لگی، ''ہاں! میں ناچوں گی۔ تمھاری خوشی کے لیے میں ضرور ناچوں گی۔ ڈانس مجھے بھی فرحت بخشے گا۔''

''بہت اچھی بات ہے۔ تمھارے لیے خاص لباس منگوایا جائے گا۔ رات کے کھانے کے بعد بڑے کمرے میں یہ رقص ہو گا۔ رباب بجانے والیوں کو بھی بلا لیں گے۔''

''رباب تو لطف کو دوبالا کر دے گا۔ میں ناچوں گی۔ ایک سادہ سی دھن پر۔ مشری مورہ! کیا مجھے سگریٹ مل سکے گی؟''

''یقیناً، میری پیاری بیٹی۔ وہ میں ساتھ ہی لائی ہوں۔'' رقاصہ نے آگے بڑھ کر بوڑھی اماں کا ہاتھ تھام لیا۔ سوکھے کمزور ہاتھوں کی نیلی موٹی رگوں میں جمے ٹھنڈے خون کو جب نرم و گرم ہاتھوں کی گداز حرارت ملی تو بوڑھی اماں کانپ اٹھی: ''اف اللہ! کل یہی ہاتھ یخ بستہ ہوں گے۔''

''د خدای پہ مان۔ میری بیٹی، اب ہم چلتے ہیں۔''

سب حیرت زدہ تھے۔ منتظر تھے، اس رات کے، جب مرگ و زندگی کا اک طرفہ امتزاج، سب اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ گھر میں موسیقی کے سر بکھریں گے۔ ناچ گانا ہو گا، وہ سب جو اس ملک کی روایت رہی ہے۔ وہ سب جو 'نہی عن المنکر' کے نام پر اب بند کر دیا گیا تھا۔ آج رباب کے نرم سر، جوان ہتھیلیوں کی تال اور افغانی ڈھولکی کی تھاپ پر

عذابِ مرگ کی سزاوار ناچے گی۔ ہر طرف سر گوشیاں ہو رہی تھیں، پھر وہ آوازوں میں بدل گئیں۔ ہر سننے والے کان اور کہنے والی زبان پر ایک ہی موضوع تھا کہ اب اس گھر کی مقدس دیواریں وہی ڈانس دیکھیں گی جس کی سزا اس رقاصہ کو دی جا رہی ہے۔ آج اس گھر میں، شہر کے کھنڈرات کے زیر سایہ، ویسی ہی ایک محفل آباد ہو گی۔

کھانا جلدی جلدی کھالیا گیا۔ دستر خوان سمیٹنے میں بھی دیر نہ لگی۔ ایک ماہر بڑھیا رباب اٹھالائی، گھر کی سب عورتیں دیواروں کے ساتھ تکیہ لگا کر بیٹھ گئیں۔ پہلے کم سن گلبدن کمرے میں داخل ہوئی۔ گلبدن جو عرصہ ہوا عورتوں سے بھی پردہ کرتی تھی۔ جو اپنے کنج سے باہر کم ہی دیکھی جاتی تھی۔ اس کے پیچھے سنک خرام رقاصہ کمرے کے درمیان بچھے افغانی قالین پر کھڑی ہو گئی۔ ہر چہرہ اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ صرف بوڑھی اماں کہیں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی سوچ رہی تھی کہ یہ رقص ناپختہ ذہنوں اور جوان دلوں پر کیا قیامت ڈھائے گا؟ اس شاہکار حسن کو آتش بجاں دیکھ کر خام دماغ بھڑک اٹھیں گے۔ ان میں کیا کیا وسوسے جاگیں گے؟

رقاصہ نے سیاہ ریشم کی میکسی پہنی ہوئی تھی، جس کے گھیرے پر نقرئی تاروں کا کام تھا۔ سفید موزے اور موتی جڑے جوتے چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ پتلی کمر کے گرد ستاروں اور موتیوں سے جڑی کامدار سنہری پٹی لپیٹی ہوئی تھی۔ چھاتی کے اوپر کالے رنگ کی کور سے سجی سپید کافوری سلک کی چولی تھی۔ گورے ننگے بازو ہاتھی دانت کے بنے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ حنا رنگ ہاتھ میں سیم و عاج کا بنا پنکھا تھا۔ سیاہ زلفوں میں سرخ پھول جڑا ہوا تھا۔ ہونٹوں کی لالی سے لعل بھی منفعل ہو رہے تھے۔ آنکھوں میں لگی ہلکی سی کاجل کی لکیر ظلمتِ شب میں اضافہ کر رہی تھی۔ سفید نورانی چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ وہ کمرے کے درمیان نظریں جھکائے کھڑی تھی۔

رباب کی دھن بکھرنا شروع ہوئی تو نشیلی آنکھوں کو حرکت دی اور پنکھا ہلانا شروع کر دیا۔ اس ہلکے سے رقص میں وہ اپنی جگہ سے کم ہی حرکت کر رہی تھی۔ برہنہ باہنوں کی چم خم، بدن کی لرزش اور کولہوں کی لچک ایک ہی مقام پر محدود رہیں۔ بس خوشبو کا ایک جھونکا تھا جو پورے کمرے کو مہکا رہا تھا۔ اس کی مضطرب آنکھیں کمرے میں موجود ہر عورت کا طواف کر رہی تھیں۔ کبھی اس چہرے کا اور کبھی اس کا۔ چہرے جن پر ہزاروں قسم کے جذبات ابھر رہے تھے۔ کسی پر شکوک و شبہات ہویدا تھے، کہیں خوشی و مسرت، حیرت و انبساط اور خوف و دہشت۔ کہیں جنون کے ولولے نہاں ہو رہے تھے۔

رباب خاموش ہوا تو وہ بھی رک گئی۔ کمرے میں سر گوشیاں شروع ہو گئیں۔ ان کو دیکھ کر رقاصہ بھی مسکرا اٹھی۔ بڑھیا نے رباب کے تاروں کو پھر چھیڑا۔ اس مرتبہ سُر تیز تھے۔ کچھ دیر وہ کھڑی رہی۔ جیسے سُر سے تال ملا رہی ہو۔ یک دم اس کے بدن میں بجلی سی کوند گئی۔ رات کے برہنہ سینے پر اس کے پاؤں رقصاں تھے۔ نرت نرت پر سینوں میں دھڑکتے دل ردھم کھو رہے تھے۔ نیم وا ہونٹوں نے چہرہ کی رونق کو بڑھاوا دے دیا تھا۔ حسین تتلی کو آزادانہ اڑتے دیکھ کر سب کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس کا سرمست ناچ دیکھ کر جوشِ مسرت سے واہ واہ کا شور بلند ہونے لگا۔

بوڑھی اماں بت کی طرح ہونٹ بھینچے خاموش بیٹھی تھی۔ دونوں ہاتھوں کی باریک انگلیاں ایک دوسرے میں گتھی ہوئی تھیں۔ یادِ ماضی اس کے دماغ میں آگ بھڑکا رہی تھی۔ گزری ہوئی باتوں کا تصور، بیتے دنوں کی یادیں ذہن کے دریچوں میں ابھر رہی تھیں جیسے کوئی جادوگر جادو کے ڈبے میں فسوں پھونک کر تصویریں بدل رہا ہو۔ کافر دنیا کی یہ البیلی گوری، یہ کومل صورت جس کے ہونٹوں پر ہلکی لالی کی چمک تھی، جس کے زلفوں میں سرخ پھول تھا، جس کی روشن آنکھوں میں کاجل کی سیاہی تھی، بوڑھی اماں کے دل میں جوانی کی مضمحل یادوں کو بھڑکا رہی تھی۔

سالوں پہلے وہ اور اس کا محبوب خاوند پھولوں اور باغات کے شہر پغمان کی گلیوں میں آزادانہ گھوما کرتے تھے۔

شاہ کا پرامن دور، جب شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں افغانی اور غیر ملکی دوشیزائیں ایسے ہی باکمال رقص پیش کیا کرتی تھیں۔ بوڑھی آنکھوں کے سامنے ماضی کے افغانستان کی یادیں رنگ بکھیر گئیں۔ لطیف و منبع عمارات کا یہی شہر پغمان، ایسی عمارات جنھیں خاموش شاعری اور منجمد موسیقی کا لقب دیا جاتا تھا۔ جہاں سر اور تال کی محفلیں سجتی تھیں۔ محبتیں جوان ہوتی تھیں۔

پھر ملک مذہبی جنگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ دور دراز کے ممالک سے مجاہدین نے آکر 'قتال اور امر بالمعروف' کا منصب سنبھال لیا۔ یہ منصب اس کے محبوب خاوند کو کندھے پر کلاشنکوف سجا کر ساتھ لے گیا۔ وہ کہاں دفن ہوا، اسے کوئی خبر نہ ملی۔ قبر کا نشان تو نہ ملا لیکن اس کو نئی پہچان مل گئی۔ اب چار بچیوں کی ماں، شہید کی بیوہ، متبرک ہستی بن چکی تھی۔ دوسری بیواؤں اور یتیم بچیوں کی مربی و سرپرست۔ اس جیسی بوڑھیوں کی مستقل اور جوان بیواؤں کی عارضی، تاوقتے کہ کسی جوان بیوہ یا کنواری کو کوئی بہادر اپنے حرم میں شامل کر کے غازی مجاہد کے بچوں کی پالن ہار بنا لیتا۔

رباب کی آواز تھم گئی تھی۔ افسردہ جذبات ہیجان زدہ ہو گئے تھے۔ بڑھیا کی انگلیاں پھر حرکت میں آئیں۔ میوزک کے شروع ہوتے ہی اس نازنین کا لچکتا مغرور بدن بھی حرکت میں آ گیا۔ بڑھیا نے افغانستان کی مقبول دھن چھیڑی تھی۔ تمام لڑکیاں بھی گنگنانا شروع ہو گئیں۔ ایک نے ڈھولکی اور دوسری نے دائرہ پکڑ لیا۔ تالیاں بجا کر باقی بھی گانے میں شامل ہو گئیں۔ مقبول ترین گانا آہستہ لے میں گایا گیا تھا لیکن اس نے تیز ردھم سے آغاز کیا اور ساتھ ہی تیز ڈانس بھی۔ وہ باکمال رقاصہ پنکھڑی کی طرح سمٹتی اور پھول کی طرح بکھر جاتی۔ خوشبو کی طرح مہکتی اور بجلی کی طرح کوندتی تھی۔ دلہا دلہن کا استقبالیہ گانا سب مل کر گا رہی تھیں:

آہستہ برو (آہستہ چل)

ماہِ من، آہستہ برو! سرورِواں، آہستہ برو!

لڑکیوں کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ تالیوں کا شور بڑھ گیا۔

دختر خاں، آہستہ برو!

خواہم زِخدا ہمیشہ باہم باشیم (میری دعا ہے کہ خدا کرے، تم ہمیشہ، میرے ساتھ رہو)

در سایۂ گل نشستہ بی غم باشیم (پھولوں کے سایہ میں، تم بے فکر، میرے ساتھ رہو)

رونقِ کاشانۂ من، آہستہ برو!

سب گا رہی تھیں اور وہ سرو قامت بے نیازی و سرمستی میں ناچ رہی تھی۔

شور میں آہیں اور سسکیاں بھی شامل تھیں۔ باہم باشیم گاتے ہوئے خاموش بیٹھی چھوٹی بہن گلبدن کے رخساروں پر آنسوؤں کے موتی چمک اٹھے۔ رقاصہ اپنے رقص میں مست ہو کر بھی ہوشیار تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اہلِ محفل ہوش و ہواس کھو چکے تھے۔ پھر جیسے بہتا ہوا دھارا ٹھہر جائے، ابلتا ہوا چشمہ یک بیک رک جائے، وہ لہراتی ہوئی ناگن کی طرح بل کھا کر بیٹھ گئی۔

بوڑھی اماں کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ اس لڑکی کو ڈانس کی دعوت دینا دانشمندی نہیں تھی۔ کچی عمر کی لڑکیاں، جوان بیوائیں سب کے دلوں میں وسوسے جاگ اٹھے ہوں گے۔ ناسمجھ نادان دل اس شعلۂ جوالہ سے مشتعل ہو گئے ہوں گے۔ لیکن اس رقاصہ کی آخری خواہش پوری کرنا بھی تو ضروری تھا۔ اس کے دل کی تسکین کا سامان مہیا کرنا بھی تو اہم تھا۔ اس ناچ گانے سے وہ بہل گئی تھی۔ وہ رقص کر کے خوش ہو رہی تھی۔ تمام آنکھیں اس کے سحر میں کھو چکی تھیں۔ گلبدن سب سے زیادہ مسحور تھی۔ بڑی اماں کا دھیان اس کی طرف

ہی تھا۔اس کی ہچکیوں میں جوانی ماتم کناں تھی۔ابھی پچھلے سال ہی اس کی منگنی ہوئی تھی۔اس مجسم شباب نے زندگی کی بیس بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ کابل کے ارد گرد پھر جنگ چھڑ گئی۔وہ بھی طالبان کے ساتھ چلا گیا۔اور پھر گلبدن، بن بیاہی بیوہ اس بڑھیا کے حوالے کر دی گئی۔ان گنت صدیوں کے جہادیوں کی جہالتی عصبیت اپنے مقابل کے روبرو پچھلے پچاس سال میں پورے انصاف کے ساتھ پروان چڑھی تھی۔ قبائلی رواج کے مطابق اب وہ معلق کنواری بیوہ اس خاندان کی ہو چکی تھی اور کہیں اور بیاہی نہیں جا سکتی تھی کیونکہ ان میں کوئی لڑکا نہیں تھا۔

رقاصہ کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔گلبدن نے نازک ہاتھوں کو مضبوطی سے سینے پر باندھ رکھا تھا۔اس کو لبھانے کے لیے رقاصہ کے سرخ ہونٹوں پر بار بار عجیب تبسم نمودار ہو رہا تھا۔اس تبسم کی ماہیت شہد جیسی تھی۔ رقاصہ کی نگاہیں مدھومتی کی طرح گل پر منڈلا رہی تھیں۔بڑی اماں سوچ رہی تھی یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے رقاصہ کے ساتھ نیکی کی ہے یا غلطی سے شیطانی کام کو دعوت؟....رقاصہ اٹھی اور سب عورتوں کے پاس سے گزرتی ہوئی واپس چل پڑی۔اس کی آنکھوں میں سورج کی چمک تھی۔ولولۂ شباب جوش زن تھا۔حسنِ نورافروز کی مالک، پُرغرور انداز میں چلتی ہوئی گلبدن کے پاس آئی۔ ''آہ! گلبدن'' رخسار پر پنکھے سے ہلکی سی ضرب لگائی اور واپس چل پڑی۔

بڑی ماں کی انگلیاں بے قراری سے کپکپا رہی تھیں۔رقاصہ نے اپنے بازو سینے پر باندھ لیے۔حنائی انگلیوں کو ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہوائی بوسہ اس کی طرف اچھال دیا۔جواں بیوہ گلبدن، آگ سی بھڑک اٹھی۔''کہاں؟''

رقاصہ بانکی چال چلتی جس طرح آئی تھی اسی طرح اندھیرے راستوں پر واپس چلی گئی۔عورتوں کی طویل قطار سے آہ کی ایک آواز کمرے کی خاموشی کو چیر گئی اور ہاں! کسی نے ایک سسکی بھی لی۔

بوڑھی اماں پکاری: ''میری بچیو! جاؤ اب اپنے کمروں میں۔'' باقی عورتیں بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے کو خالی کر گئیں۔گلبدن سرخ رخساروں سے آنسوؤں کا عرق پونچھ رہی تھی۔وہ روانہ ہوئی تو ماں نے اسے روک لیا۔

''تم آج کی رات نوافل اور تلاوت کے بعد دعا کرنا۔ یا اللہ! اس بے کس بیچاری کی بخشش فرما دے۔''

کچھ دیر خاموش کھڑی رہی پھر اسے پیار کرتے ہوئے بولی: ''جاؤ! اب اپنے کمرے میں اور گڑگڑا کر اللہ کو پکارو۔''

نوجوان بیوہ واپس چل پڑی۔اس کے انداز میں بھی تمکنت تھی۔وہ خوبصورت شاہانہ چال چل رہی تھی۔اس سروِرواں کو دیکھ کر بوڑھی اماں کی ہچکی بندھ گئی۔

اگلی صبح، کہر کی چادر میں لپٹی، غم آلودہ سحر کی خاموشی توڑتے جوان اندر داخل ہوئے اور رقاصہ کو پکڑ کر لے گئے۔اس کے بعد گولی چلنے کی آواز آئی اور اللہ اکبر کے نعرے گونج اٹھے۔بوڑھی اماں روتی ہوئی سجدے میں گر گئی۔

دن کی روشنی پھیلی تو گلبدن کہیں بھی نظر نہ آئی۔ دو دن بعد اس کا لکھا ایک خط ملا :

''مشری مورہ! مجھے معاف کر دینا۔میں تم کو چھوڑ آئی۔پاکستان جا رہی ہوں۔ کبھی حالات بہتر ہوئے تو لوٹ آؤں گی۔ ورنہ جنت میں ملاقات ہوگی۔''

خط اس کے کانپتے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ وہ ایک آہ کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئی۔

زندگی بعد از موت؟ تصور میں برستی پرانی یادیں، جادو کے ڈبے میں رقص کناں تصویریں، رقاصہ کا خوبصورت چہرہ، کالی زلفوں میں سرخ پھول، سیاہ آنکھیں، کاجل کی لکیر، سرخ یاقوتی ہونٹ جن کو چھوتی ہوئی حنائی انگلیاں اور ایک اڑتا ہوا بوسہ، ایک معلق بوسہ۔

عفت نوید

ردی

اس کا نام دانش تھا۔ کہنے کو وہ سب کچھ رد کرتا تھا مگر کچھ رد نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے ایسی ردی ہو کر رہ گیا تھا جسے نہ توری سائیکل کیا جاسکتا تھا، نہ ہی مکمل طور پر نیست و نابود کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے آلودگی کے مسئلے کی طرح جوں کا توں زمانے کی ٹھوکروں میں پڑا تھا۔ زندگی کو تماشا سمجھنے والا، خود تماشا ہو کر رہ گیا تھا۔ ایسا تماشا جسے بغیر ڈگڈگی بجائے ہر وقت دیکھا جا سکتا ہے۔

اپنے اس تماشے سے وہ اکثر خود تنگ آ جاتا۔ جب کبھی یاسیت کا دورہ اس پر حملہ آور ہوتا وہ نیٹی جیٹی کے پل کا رخ کرتا اور پل پر کھڑے ہو کر پہروں پر شور لہروں کو محبت سے دیکھا کرتا، یوں محسوس ہوتا کہ وہ بس اب کسی بھی لمحے چھلانگ لگانے کے ارادے سے قدم اٹھانے ہی والا ہے۔ وہ اسی قدم کو سڑک کی جانب موڑ کر دوسرا قدم بڑھا دیتا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا گویا وہ خودکشی کے ارادے کو عملی جامہ پہنا چکا ہے۔ یوں لگتا جیسے زندہ رہنے کا فیصلہ ہی اس کے لیے موت ہے اور موت کے لیے موت ضروری نہیں ہوتی۔ یوں اسے زندگی ہی میں کئی بار موت آئی۔

پہلی بار اس وقت جب اسے ایک لڑکی کے اغوا کے الزام میں پولیس پکڑ کر لے گئی۔ اس کا قصور اتنا تھا کہ لڑکی کی ڈائری میں اس کا ذکر تھا، جب کہ وہ لڑکی کو جانتا تک نہیں تھا۔ یا اگر شناسائی رہی بھی ہو گی تو اب وہ اس کی یاد سے محو ہو چکی تھی۔ ماں باپ بھی اسے مجرم سمجھ رہے تھے۔ ایک بار اس کے چچا نے اسے اعتماد میں لے کر پوچھا بھی تھا کہ وہ سچ بتا دے، سب کچھ وہ خود سنبھال لیں گے، مگر اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔

پولیس اس پر چار دن تک تشدد کرتی رہی پانچویں دن پولیس نے اسے معذرت کر کے آزاد کر دیا کہ انہیں اوپر بھی جواب دینا ہوتا ہے۔ لڑکی کسی اور کے ساتھ بھاگی تھی اب گھر واپس آ گئی ہے۔

کسی کو سب کے سامنے ہتھ کڑی پہنانے والے اس کی بے گناہی کا اعتراف سب کے سامنے نہیں کیا کرتے۔ قانون کی نظر میں وہ بھی خاموشی سے بے قصور قرار پایا تھا لیکن لوگوں کی نظر میں وہ اب بھی مجرم تھا ان کی نگاہیں اسے بے کل رکھتیں۔ وہ نیٹی جیٹی کے پل پر چلا آیا مگر زندگی ہارنے کے بجائے ایک بار پھر وہ مرنے کے لیے تیار ہو گیا اور واپس چلا آیا۔

نوکری کے حصول کے لیے علم کی نہیں ڈگریوں کی ضرورت ہوتی ہے اس نے بھی زندگی کرنے کے لیے ایم اے کی سند حاصل کر لی تھی اور ایک اسکول میں معلم کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ بچوں کے ذہن سے اٹھنے والے سوالات اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے۔ وہ ان سے بڑی بڑی عقل و دانش کی باتیں کیا کرتا۔ بچے اسے اور اس کی باتوں کو پسند کیا کرتے۔ بڑوں سے گفتگو میں وہ خاص احتیاط کیا کرتا۔ کیوں کہ بڑوں کو پورا یقین تھا کہ ان کے پاس عقل بھی ہے اور فہم بھی اس لیے اسے ان بڑوں سے چھوٹی باتیں کرنی پڑتیں۔

دوسری بار وہ نیٹی جیٹی کے پل پر اس وقت آیا جب اس کی منگیتر نے یہ کہہ کر منگنی کی انگوٹھی واپس کر دی کہ

محض علم کی روشنی سے گھر کے اندھیروں کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ جب کہ بجلی کے بل سمیت دیگر بلوں کے لیے استاد کا بل سے باہر آنا ضروری ہے اس بار بھی خود اذیتی کے طور پر اس نے موت ہار دی۔

تیسری بار آنکھوں میں وحشت لیے وہ اس وقت پل پر آ کھڑا ہوا جب اسے بچوں کے اذہان کو منجمد کرنے، انہیں سلیبس سے ہٹ کر پڑھانے اور بچوں کے سالانہ نتائج خراب کرنے کا ذمہ دار ٹھہرا کر برطرف کر دیا گیا۔ اس بار بھی وہ وہ صرف موت کو دیکھ کر رہ گیا اور زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حجرے میں چلا آیا۔

وہ ایک بار پھر نوکری کی تلاش میں اٹھ کھڑا ہوا اس کھوج میں اسے ایک کثیر الاشاعت ماہنامے میں سب ایڈیٹر کی نوکری مل گئی۔ اس رسالے میں سچی کہانیاں شائع ہوتی تھیں۔ ایک دن رسالے کے ایڈیٹر نے اس سے بھی سچی کہانیاں لکھنے کو کہا۔

''مگر جناب ابھی میری کہانی تو شروع بھی نہیں ہوئی۔'' اس نے ایڈیٹر کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''تمہاری نہیں دوسروں کی۔'' ایڈیٹر نے اسے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے سر مجھے کچھ دن کی مہلت دیں۔''

''مہلت مگر کس لیے؟'' ایڈیٹر حیران ہو کر بولا۔

''سر سچی کہانیوں کی تلاش میں، مجھے تگ و دو کرنا ہو گی اخباری سطور کی حقیقت جاننا ہو گی، کہانی بن چکے بزرگوں سے ملنا ہو گا اور.........''

''میاں اس کی ضرورت نہیں کیوں دفتر بند کرواؤ گے۔ اسی میز پر بیٹھ کر کہانی گھسیٹ دو۔'' ایڈیٹر اس کی بات کاٹ کر بولا اور وہ ایڈیٹر صاحب کے حکم کے مطابق کہانی گھسیٹنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک کہانی ایڈیٹر صاحب کی میز پر رکھ دی۔

''میاں فلسفہ نہیں، لوگ فلسفہ نہیں سمجھتے کوئی پھڑکتی، سلگتی تحریر لکھو۔''

اس کا قلم زہر اگلنے لگا مگر ایڈیٹر صاحب سے یہ تلخی بھی ہضم نہ ہو سکی۔ پانچ روز میں اس نے دس کہانیاں ایڈیٹر صاحب کو تھمائیں۔

آخری کہانی پر ایڈیٹر صاحب نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے:

''تمہاری یہ کہانیاں ان رسالوں میں تو چھپ سکتی ہیں جو اپنے خرچے پر چلتے ہیں مگر وہ تمہیں کوئی خرچے کے بجائے رسالے کی اعزازی کاپی ہی دے سکیں گے۔ یہ ردی ہمارے کسی کام کی نہیں۔''

اور وہ اپنی میز کے اوپر اور درازوں کے اندر سے ساری ردی نکال کر گھر لے آیا۔ یہ دن اس کے لیے بڑے کار آمد رہے، کہنے کو وہ فارغ تھا لیکن اس کا ذہن اس کے ہاتھوں کو چین نہ لینے دیتا۔ حقیقت جاننے کے جستجو نے اسے خود سے، دنیا و مافیا سے بے خبر کر دیا تھا۔ وہ صفحے کالے کرتا رہا۔ اس کے کچھ سر پھرے دوست اس کی تحریر کی کاٹ سے بہت متاثر تھے، انہوں نے اس کی نگارشات کو مختلف ادبی رسائل میں بھیجنا شروع کر دیا اور رسائل اسے اجرت کے طور پر اعزازی کاپیاں بھیجنے لگے اس کے کمرے میں اعزازی کاپیوں سمیت ردی کا ایک انبار جمع ہو تھا۔

ماں باپ اس کے لیے لڑکیاں دیکھ رہے تھے لیکن پہلی بار ہی ہر جگہ سے صاف انکار ہوا۔ کاغذ پر سیاہی بکھیرے والے سے رشتہ جوڑ کر کون اپنی بیٹی کا مقدر سیاہ کرتا؟ کسی نے والدین کو ''دارلامان'' جانے کا مشورہ دیا۔ مگر وہاں کے منتظمین نے بھی رشتے کی نوعیت جانتے ہوئے اپنے ادارے کی لڑکی کے لیے یہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ کاغذ پر الفاظ انڈیلتے رہنے سے چائے کی خالی پیالی کو فرق نہیں پڑتا۔ اتفاق سے اس وقت فراست موجود تھی جو کہ دارلامان

میں ہی پلی بڑھی تھی اور وہاں تدریسی فرائض سرانجام دیتی تھی۔ اس نے از خود اپنے آپ کو دانش کے رشتے کے لیے پیش کر دیا۔ منتظمین کے لیے یہ بہت بڑا مسئلہ تھا اتنی اچھی ٹیچر ان کے ہاتھ سے نکل رہی تھی، مگر وہ اسے اس کے شرعی حق سے بھی محروم نہیں کر سکتے تھے۔

یوں فراست دانش کی زندگی میں داخل ہو گئی۔ وہ دانش کی علمیت کی دل سے قائل تھی، اس نے دانش کی پیٹھ کیا تھپکی کہ اسے کسی کی پروا نہ رہی وہ دیوانہ وار اپنے کام میں جت گیا۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وہ شام کو ٹیوشن پڑھاتے۔ کسی بڑی ضرورت کی ضرورت انھوں نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

ان کی شادی کو آٹھ برس ہو چکے تھے۔ ماں باپ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور ایک ایک سال کے وقفے سے دو بچے دنیا میں آ چکے تھے۔ یہ دونوں بچے کاوش اور زیست تھے۔ زندگی ان بچوں کو ایسے گھر میں بڑا کر رہی تھی، جس کے بڑے بھی ابھی تک بڑے نہ ہو پائے تھے پھر وہ محض اپنے قامت کے بل پر کیسے بڑے ہو سکتے تھے۔ بڑے ہونے کے لیے جن حدود و قیود کو پھلانگنا ضروری ہے، وہ اس کی پٹی تک بھی نہ پہنچ سکتے تھے کیوں کہ ان کے والدین نے وہ پٹی سرے سے بچھائی ہی نہ تھی۔

دانش اور فراست کے قول و فعل کی یکسانیت نے کاوش اور زیست پر آگہی کے سارے در کھول دیئے تھے۔ وہ والدین تھے یا آٹھواں عجوبہ، زندگی کے تھپیڑوں سے پینگیں بڑھا کر مطمئن تھے۔

دانش کاوش اور زیست کو اکثر نیٹی جیٹی کے پل پر لے کر جایا کرتا۔ اس نے انھیں اپنی زندگی کے اس دور کے بارے میں بھی بتا دیا تھا جب وہ زندگی ہارنے کی خواہش لے کر پل پر آتا اور موت کا انعام لے کر واپس جاتا تھا۔ اپنے تیئں وہ اس واقعے سے بچوں میں جینے کی لگن اور ہمت نہ ہارنے کا درس دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

گھر میں بچے دانش اور فراست کی باتوں سے خوشبو محسوس کرتے۔ آگہی کے اجالے سے فیض یاب ہوتے اور جب کبھی ان کا بچپن انھیں گھر سے باہر کی راہ دکھاتا، وہ چلے تو جاتے مگر کھلی فضا میں انھیں شدید گھٹن محسوس ہوتی، وہ ہی لمبی سانسیں لینے لگتے۔

بچے خاصے بڑے ہو گئے تھے لیکن اسکول جانا نہیں چاہتے تھے۔ دانش اور فراست جانتے تھے کہ بچوں کا گھر سے باہر نکلنا اور اسکول جانا کتنا ضروری ہے۔ لہذا انھیں سمجھا بجھا کر اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ دو محلے چھوڑ کر ہی بچوں کا اسکول تھا بچے ایک دوسرے ہاتھ پکڑ کر اکیلے ہی اسکول جایا کرتے تھے۔ گھر اور اسکول سے ملنے والی تعلیم اور دوستوں کی صحبت سے ان بچوں کو ایسا کیا ملا، ان کے ننھے ذہنوں نے ایسا کیا سمجھ لیا کہ وہ گم سم رہنے لگے۔ زندگی کی دلچسپیوں میں انھوں نے حصہ لینا ہی چھوڑ دیا۔ وہ کسی قسم کی شرارت کرتے، نہ ہی انھیں بھوک لگتی۔ دانش اور فراست اپنے بچوں کی اس ذہنی کیفیت سے پریشان تھے۔

ایک دن کاوش اور زیست جب اسکول سے گھر نہ پہنچے اور اسکول کا فون بھی مسلسل مصروف ملا تو دانش سیدھا اسکول پہنچا، معلوم ہوا کہ بچے ایک گھنٹہ پہلے ہی گھر کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ دانش بھاگم بھاگ گھر پہنچا کہ شاید بچے رستہ بدل کر گھر آ گئے ہوں، فراست پریشان حال بیٹھی تھی۔ آہٹ سن کر وہ بے تابی سے اس کی جانب بڑھی لیکن اس کے پیچھے بچوں کو نہ پا کر اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اس نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا۔

دانش کے لیے تسلی کے تمام الفاظ اپنی معنویت کھو چکے تھے۔ فراست کو تسلی دینا اسے ڈھکوسلا لگ رہا تھا۔ وہ بچوں کے دوستوں کو فون کرنے کی غرض سے ٹیلی فون کے قریب آ گیا اس سے پہلے کہ وہ ریسیور اٹھاتا گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے بے دلی سے ریسیور اپنے کان سے لگا لیا، فراست بھی دانش کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ فون سنتے ہوئے اس کے

چہرے کے تاثرات نے فراست کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ دانش نے فون پر کہی جانے والی کچھ باتیں دہرائیں، اور ریسیور پٹک کر دروازے کی جانب دوڑا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو جب دانش نے ایک اسپتال کا نام لے کر چلنے کو کہا تو فراست کا دل بیٹھ گیا۔ دونوں بچے ایمر جنسی وارڈ میں بے ہوش تھے۔

آپ کے بچوں کے بیگ سے یہ پرچہ ملا ہے۔ دانش کے استفسار پر ڈاکٹر نے اسے ایک کاغذ تھما دیا۔ بچوں نے لکھا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کی طرح شہادت کی انگلی اٹھائے اپنی باری کے منتظر نہیں رہنا چاہتے، چنانچہ اس تماشے کو ختم کر رہے ہیں۔

بچوں میں سانس تھی مگر آس مر چکی تھی۔ اور دانش کے لیے یہ ہی بات اذیت کا باعث تھی۔ وہ سمجھتا تھا بچے اس کا عکس ہیں، اس کا پرتو ہیں، مگر اس نے انہیں زندگی کی سچائیاں دکھا کر ان کا بچپنا چھین لیا تھا آگہی کے در ان پر کھول کر ان کی معصومیت ختم کر دی تھی۔ سچائی کی آگ نے ان بچوں کو سرد کر دیا تھا۔ حقائق کے ادراک نے ان بچوں کو گمراہ کر دیا تھا یا صحیح راہ دکھائی تھی۔ اپنے والدین کے ہر فعل کو اپنے دماغ کے کمپیوٹر میں فٹ کر کے وہ یہی کر سکتے تھے۔ بچے بچ گئے تھے مگر وہ ختم ہو رہا تھا۔ ماں کو بچوں کے پاس چھوڑ کر گھر چلا آیا۔ اپنے لکھے ہوئے تمام کاغذات کا پلندا ایک جگہ جمع کیا، موت کی راہ دکھانے والے ان کاغذات کو وہ ماچس کی آگ دکھانا چاہتا تھا کہ یک اسے ایک خیال آیا۔

فراست اور بچے گھر میں داخل ہوئے تو حیران رہ گئے۔ اس گھر میں آج تک کوئی کھلونا نہیں آیا تھا مگر آج دانش کھلونوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ کاغذ کے جہاز، کاغذ کی گیندیں، کاغذ کی کشتیاں، کاغذ کے پھول، یہ سارے کھلونے گھر میں تیر رہے تھے اور دانش قہقہے لگا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد فراست، کاوش اور زیست کی ہنسی کی آوازیں بھی ان قہقہوں میں شامل ہو گئیں۔

فرخ انیق

چنڈال

کئی روز سے وہ سارا سارا دن ریاست نائی کے حمام پر ہی بیٹھا کیبل پر نانا پاٹیکر کی فلمیں دیکھتا رہتا۔ دوسرے محلے کے کسی حمام میں آ کر سارا دن بیٹھے رہنے کے اس اچانک سے بننے والے معمول نے اسے محلے والوں کی نگاہ میں مشکوک تو کر دیا تھا لیکن ریاست کے سوا ابھی تک کسی کو پتہ نہیں تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ آج بھی ٹھیک 2 بجے لڑکیوں کے کالج کو چھٹی ہوئی تو وہ باہر نکل کر تھڑے پر کھڑا ہو گیا۔ بظاہر ایسا لگتا تھا جیسے وہ باہر تار پر لٹکے ہوئے تولیے اتارنے کو نکلتا ہے لیکن وہ ایک آدھ تولیا اتار کر کھڑا رہتا اور جب کوئی بزرگ محلے دار اُسے گھورتا ہوا گزرتا تو وہ جلدی سے بانس کے ساتھ تولیے کو چھیڑنے لگتا۔ اُسے معلوم تھا کہ لمبے کالے سے بستے والی وہ لڑکی، جس کے سفید دودھیا پاؤں دیکھ کر اس کی رالیں ٹپکنے لگتی ہیں، نکڑ والے ملک دلدار کی بیٹی ہے۔ اُس نے اُسے کئی بار بغیر نقاب کے بھی دیکھا ہوا تھا۔ لیکن اب وہ اس دور دور سے دیکھنے کے معمول سے تنگ آ گیا تھا۔ اُس رات موچیوں کے تھڑے پر بیٹھ کر رانے طیب نے بھی اُسے یہی کہا:

''یار کب تک یونہی دور دور سے نظارے کرے گا، بلو! میں تو کہتا ہوں سویرے ہی گیم ڈال دے، سیٹ ہو گئی تو ٹھیک نہیں تو کسی اور کے پیچھے لگ، ایویں ٹائم تو نہ ضائع کر''

☆☆☆

وہ دن اُس کی زندگی کے دو چار حسین ترین دنوں میں سے ایک تھا۔ دفتر کے چپراسی نے اسے آ کر بتایا کہ اس کے گھر سے فون آیا ہے اور اطلاع ہے کہ اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ ''نور'' اس کے ذہن میں جھماکے سے ایک آواز اُبھری۔ اس نے پل بھر کو چپڑاسی کے منہ کی طرف دیکھا جیسے وہ اس سے مبارک باد کے الفاظ سننے کا انتظار کر رہا ہو اور پھر اس کے حسبِ معمول لٹکے ہوئے منہ کو نظر انداز کرتا ہوا جلدی سے اُٹھا اور دفتر سے چھٹی لے کر سیدھا حیدر حلوائی کی دُکان پر پہنچا۔ حیدر کے گلاب جامن اس کے پسندیدہ تھے۔ جب حیدر نے اُس سے پوچھا کہ کتنے گلاب جامن دے تو اس کی جانب سے کوئی جواب نہ مل پایا۔ یا تو وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا یا پھر مارے خوشی کے اس کی زبان اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ حیدر نے خود ہی دو کلو گلاب جامن تول کر اس کی طرف بڑھا دیئے جنھیں تھام کر وہ زیرِ لب مسکراتا ہوا اپنی پھٹیچر سی یاماہا پر، جو اس دفعہ پہلی کِک پر ہی اسٹارٹ ہو گئی تھی، بیٹھ کر گھر کو چل دیا۔

☆☆☆

ٹُنڈ منڈ اور جلے ہوئے درختوں سے اٹا ہوا یہ ویرانہ جمن پورہ کا واحد قبرستان تھا۔ شروع شروع میں گاؤں کی آبادی کم تھی، مہینے میں کوئی دو ایک لوگ مرتے تھے۔ ایسے میں گاؤں کے لوگ خصوصاً جوان محلے دار مل جل کر اس کی قبر کھود دیتے۔ مرنے والے کے گھر کا کوئی ذمہ دار فرد جا کر انھیں قبر کھودنے کی جگہ بتا دیتا اور ساتھ پانی وغیرہ کا انتظام کر دیتا۔ محلے کے آوارہ ترین نوجوان بھی اس دن والدین کے ڈر سے یا پھر محلے داروں کی شرم سے قبرستان کا چکر ضرور لگاتے خواہ ایک آدھ منٹ کو ہی کدال کیوں نہ چلائیں۔ کئی سالوں سے گاؤں میں یہی نظام چل رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ

آبادی بڑھنے لگی اور مرنے والوں کی تعداد اور رفتار بھی۔ اب نوجوان بھی اسے اپنی بے عزتی خیال کرنے لگے کہ وہ قبرستان جا کر کسی کی قبر کھودیں۔ ان کی گہری نیلی پینٹوں پر مٹی کے داغ لگ جاتے اور پسینے سے ان کی مہنگی رنگین بنیانیں خراب ہو جاتیں۔ پہلے پہل تو صرف نوجوانوں نے اس روایت سے کنارہ کیا مگر پھر ادھیڑ عمر مرد بھی ہمت ہار گئے اور یوں جمن پورہ کے قبرستان میں ایک گورکن کی ضرورت پیش آئی۔

☆☆☆

وہ آج قمیض کا کالر کھڑا کر کے گھر سے نکلا اور ریاست نائی کے حمام پر جانے کی بجائے ٹِبے والی گلی میں پورے 2 بجے پہنچ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ بازار میں کیچڑ کی وجہ سے وہ اسی گلی سے گزر کر جائے گی۔ وہ کاکے درزی کے گھر کے آگے کھڑا ہو گیا اور جونہی وہ گلی میں داخل ہوئی اُس کے سامنے آ گیا۔ اس کے بعد جو ہوا یہ اُس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی، پہلے بھی ایسا کئی بار ہو چکا تھا۔ اُن درجنوں لڑکیوں کی طرح ملکوں کی لڑکی نے بھی اُسے یہی کہا کہ ''اپنی ماں سے جا کے دوستی کر وا اور آئندہ اگر مجھے روکنے کی کوشش کی تو شور مچا کے سب کو اکٹھا کر لوں گی''، لیکن اُس نے ذرا بھی بے عزتی محسوس نہ کی۔ شور مچا کر سب کو اکٹھا کرنے والی بات پر ایک بار اُس کے ہاتھ کانپنا تو شروع ہو گئے لیکن اُس نے جیب سے نسوار کی پڑیا نکالی اور ایک گولی بنا کر نچلے ہونٹ تلے رکھ کر جلدی جلدی چلتا ہوا نکل گیا۔ شام کو رانے طیب کو بھی اس نے بتادیا کہ ''باوا جی یہ بچی تو اپنے ہاتھ نہیں آنے والی، کوئی اور گیم سوچو''اُس رات وہ دونوں دیر تک باہر کھیتوں میں بیٹھ کر چرس پیتے رہے اور رات گئے اُٹھ کر شہر کے بدنام ترین علاقے کی طرف نکل گئے۔

☆☆☆

سُرخ کمبل میں لپٹی ہوئی وہ پری واقعی میں سراپا نور ہی تھی۔ ''اس کے لیے نور سے بہتر اور کیا نام ہو سکتا ہے؟'' اپنی بچی پر پہلی نظر ڈال کر اُس نے سوچا۔ جب اُسے سرکار کی طرف سے خط آیا تھا کہ اُسے نوکری مل گئی ہے تو مارے خوشی کے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے، یا جب اس کے ابا نے اُسے آکر بتایا تھا کہ ''پُتر تیری پھپھی مان گئی ہے کلثوم سے تیرے رشتے کے لیے'' تو وہ اتنا خوش تھا کہ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ جواب میں کیا کہے۔ یا پھر جب اس کی بی اے میں فرسٹ ڈویژن آئی تھی تو وہ حیدر حلوائی سے رس گلے اور گلاب جامن لے کر رستے میں سب کو کھلاتا ہوا، بھاگتا ہوا گھر پہنچا تھا، خوش تو وہ اس دن بھی بہت تھا۔ مگر یہ خوشی کی ایسی قسم تھی جس سے اُس کی آج سے پہلے کچھ شناسائی نہ تھی۔ اُس نے آگے بڑھ کر اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں میں لیا تو ''نور'' کے نور سے اس کی آنکھیں چُندھیا گئیں۔

☆☆☆

وہ گندے اور اُلجھے ہوئے لمبے بالوں والا شخص پتہ نہیں کہاں سے آیا تھا۔ پہلے کچھ دن تو وہ گاؤں کی مختلف گلیوں میں سوتا رہا۔ وہ گلی کے کسی ایسے کونے میں جا بیٹھتا جہاں سے کسی کا گزر ہونے کے امکانات کم ہوتے اور پھر وہیں کئی دن گزر جاتے۔ پہلی بار اُس نے مراد باجوے کے کہنے پر ساتھ آٹھ بچوں کے ساتھ مل کر اس کے بیٹے شعیب کی قبر کھودی اور پھر اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ وہ گاؤں کے کچھ بچوں کو ساتھ ملاتا اور قبر کھود دیتا۔ بدلے میں متوفی کے گھر والے بچوں کو دس دس بیس بیس روپے دے دیتے اور انھی کے ہاتھ اس کے لیے کھانا بھی بھجوا دیتے۔ رفتہ رفتہ اسے اس کام کی عادت بھی ہو گئی اور تجربہ بھی۔ اس کے پاؤں چوڑے اور ہاتھ سخت ہو گئے اور بازوؤں میں رگیں اُبھر آئیں۔ کدال اور بیلچے کے سخت دستے اب اس کے ہاتھوں میں چھالے نہیں ڈالتے تھے۔ اب وہ اکیلا ہی چند گھنٹوں میں قبر کھود دیتا۔

کچھ روز تو اُس نے گاؤں کی گلیوں اور بازاروں کو عارضی ٹھکانہ بنائے رکھا لیکن پھر ایک روز وہ میل سے جمی ہوئی کھچڑی داڑھی لیے قبرستان ہی منتقل ہو گیا۔ اُس نے کچھ پودے وغیرہ ہٹا کر تھوڑی سی جگہ بنائی اور وہیں مستقل ڈیرہ جما

لیا۔ آٹھ دس ماہ وہ گرمی اور سردی کے تھپیڑے کھُلے آسمان تلے سہتا رہا۔ اُس کی جلد گرمیوں میں جل کر سُرخ ہوئی اور سردیوں میں یہ سرخ چھلکے اُترنے لگے۔ پھر جب یوسف جولاہے کی ماں مری تو قبر کھودنے کی اُجرت کے طور پر اُس نے اپنی دُکان سے اُتری ہوئی پرانی برساتی ترپال اُسے دے دی، جسے اُس نے قبرستان سے ہی کچھ لکڑیاں کاٹ کر ایک خستہ حال جھونپڑی کی شکل دے دی۔ اتنا عرصہ کھلی فضا میں رہنے کے بعد اُسے جھونپڑی کی نہ تو ضرورت رہی اور نہ عادت۔ اُس کے اوزار تو جھونپڑی میں پڑے رہتے مگر کبھی کسی نے اُسے جھونپڑی میں لیٹے، سوتے یا کھانا کھاتے نہ دیکھا۔

☆☆☆

اب بھی وہ ریاست نائی کی دکان پر جا کر بیٹھتا اور کالج کی آخری طالبہ کے گزرنے کے بعد اُٹھ کر نکل جاتا۔ آہستہ آہستہ محلے کے لوگ بھی جان گئے کہ یہ حمام کا دروازہ کھول کر سامنے بینچ پر کیوں بیٹھتا ہے۔ ایک دو بندوں نے دبے لفظوں میں ریاست نائی سے کہا کہ وہ تو لفنگا ہے تم ہی کچھ خیال کر لو، تو ریاست نے 700 روپیہ جو اُس سے اُدھار لیا تھا واپس کر دیا اور اُسے کہا ''یار محلے والے باتیں کرتے ہیں ذرا کچھ دن کے لیے آگے پیچھے ڈیرہ لگا لے، مجبوری ہے یار''

ریاست نائی کی دکان سے اُٹھ کر وہ ٹانگوں والے اڈے میں جا بیٹھا۔ وہ چرس بیچنے کا کاروبار کرتا تو چوری چوری تھا لیکن پتہ سب ہی کو تھا۔ علاقے کے جس بندے کی بھی اس کے ساتھ سلام دعا ہوتی اس کا مطلب یہ ہوتا کہ یا تو وہ چرس پیتا ہے یا پھر چند دنوں تک پینا شروع کر دے گا۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے کہ گاؤں کا ناظم بھی اُس سے چرس لیتا ہے اور بدلے میں اس کی پشت پناہی کرتا ہے۔ اس بات کی صداقت کی دلیل یہ دی جاتی کہ ہر بار پکڑے جانے پر وہ دو دن میں ہی تھانے سے چھوٹ آتا۔

☆☆☆

نور کے آنے سے اُس کے گھر کی رونق جیسے دوبالا ہو گئی تھی۔ ویسے تو گھر کے سبھی افراد کو نور سے بے انتہا پیار تھا مگر باپ اور بیٹی کے پیار کی مثال نہیں تھی۔ وہ جتنا وقت بھی گھر گزارتا نور کو گود میں لے کر اُس سے باتیں کرتا رہتا جن کے جواب میں وہ اوں آں سے زیادہ کچھ نہ کہتی۔ کبھی اس کے وہ دانت تھوڑی تھوڑی دیر بعد گنتا رہتا جو ابھی نکل رہے تھے۔ اُس کا دفتر جانے کو دل نہ چاہتا اور جب وہ نور کے ماتھے پر دس بارہ بوسوں کے بعد دفتر چلا بھی جاتا تو سارا دن اپنی بیٹی کی صورت ذہن میں لا کر اکیلے میں ہی مسکراتا رہتا۔ شام کو گھر واپسی پر وہ جلدی سے بھاگ کر نور کے کمرے میں پہنچتا اور اسے ان کھلونوں سے کھیلنا سکھاتا رہتا جنھیں ابھی نور پکڑ بھی نہیں سکتی تھی۔ ایک چھوٹی سی بچی ہی تو تھی نور، کیا خاص بات تھی اُس میں؟ بیٹیاں تو سب کے گھر پیدا ہوتی ہیں لیکن اُس میں واقعی کوئی خاص بات تھی۔ وہ اُس کی بیٹی نہیں جیسے اُس کے اپنے وجود کا ہی ایک حصہ تھی۔ اس ایک چھوٹے سے اضافے نے اُسے مکمل کر دیا تھا۔ اب اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔

☆☆☆

جس روز گاؤں میں کوئی مرگ ہو جاتی وہ دن تو اُس کا مصروفیت میں گزر جاتا لیکن عام دنوں میں وہ سارا سارا دن جھونپڑی کے باہر اُجڑے ہوئے کیکروں کی چھاؤں میں نیم دراز اپنی گہری نیلی آنکھوں سے نہ ختم ہونے والے آسمان کو گھورتا رہتا، ان قبروں سے کہیں زیادہ گہری آنکھوں سے جو وہ دیکھتے ہی دیکھتے چند گھنٹوں میں کھود دیتا تھا۔ عموماً گاؤں سے کوئی نہ کوئی اُسے کھانا بھجوا دیتا، لیکن اگر کسی دن کہیں سے بھی کچھ نہ آتا تو وہ وہیں لیٹا آسمان کو گھورتا رہتا۔ اکثر جو بچے اُس کے لیے کھانا لاتے وہ اُس کے پاس بیٹھ کر اُس سے سوال کرتے رہتے لیکن وہ خاموشی سے بیٹھا اپنے خوف ناک اور بے ڈھنگے ہاتھوں سے کھاتا رہتا۔ گاؤں کے بہت کم لوگوں نے اُس کی آواز سُنی تھی۔ جب کوئی شخص اُسے قبر کھودنے کے

بارے میں ہدایات بھی دیتا تو وہ سر ہلا کر ہاں کا اشارہ کر دیتا۔ آوارہ لڑکے اُس کی جھونپڑی میں بیٹھ کر چرس، افیون اور دیگر نشے کرتے رہتے، اُس نے نہ کبھی کسی سے بات ہی کی اور نہ کبھی کسی کو ٹوکا۔

☆☆☆

یوں ہوا کہ گاؤں کا ناظم ملک سے باہر چلا گیا جس کی وجہ سے اس کا کاروبار پہلے ماند پڑا اور پھر بند ہو گیا۔ اب گاؤں میں دو تین اور لوگوں نے، جن کی باثر شخصیات سے واقفیت تھی، اس کی جگہ لے لی۔ وہ نشہ بیچنے سے صرف کرنے پر آ گیا۔ اس کے علاوہ کام تو اور کوئی تھا نہیں سو چند ہی دنوں میں وہ پائی پائی کا محتاج ہو گیا اور اپنے نشے کی ضرورت پوری کرنے کے لیے بھی اُسے چوری کا سہارا لینا پڑا۔ ایک دن اُس نے عنایت جٹ کے گھر سے پانی والی موٹر چُرا کے بیچی، اگلی دفعہ چودھری رستم کے بیٹے کی سائیکل اور پھر ایک ایک کر کے سب گٹروں کے ڈھکن۔ چھوٹی موٹی ہر وہ چیز جو وہ چرا سکتا تھا، چرا چکا تھا۔ اس پر جب گلی محلے میں چوریاں ہونا شروع ہوئی تو لوگ بھی محتاط ہو گئے اور اپنی چیزیں تالوں میں رکھنے لگے اور رات کو ایک چوکیدار کو گاؤں میں پہرے کے لیے بھی رکھ لیا۔ چند دن اُس نے چوری کے مال سے کمائے پیسوں پر گزارا کر لیا مگر آخر انھیں ختم ہونا ہی تھا۔ کام کرنے کی عادت بالکل نہیں تھی اس لیے فاقوں تک نوبت آ پہنچی۔

☆☆☆

اُس کی زندگی کا ہر فیصلہ اب نور سے متاثر ہوتا۔ وہ کیا کرے کیا نہ کرے، اُسے کہاں جانا چاہیے کہاں نہیں جانا چاہیے، وہ کیا خریدے کیا نہ خریدے۔ ہر وقت اُس کے دماغ میں یہی چلتا کہ اگر یہ کروں گا تو میری بچی کو کیا فائدہ پہنچے گا، وہ نہ کروں گا تو نور کو کیا نقصان ہو سکتا ہے۔ ایک روز وہ بیٹھ کر اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنتے ہوئے دیکھتا اور پھر اسی حساب سے مستقبل کی ساری منصوبہ بندی کرتا تو اگلے روز وہ اُسے ائیر ہوسٹس کے یونیفارم میں دیکھ رہا ہوتا۔ دُنیا کا شاید ہی کوئی پیشہ ہو جس میں اُس نے اپنی بیٹی کو نہ دیکھا ہو، کبھی کبھی تو کلثوم پریشان ہو جاتی کہ اکیلی نور بے چاری بڑی ہو کے کیا کیا بنے گی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نور صحن میں بھاگنے دوڑنے اور اسے ابو ابو کہہ کر پکارنے لگی۔ وہ چھ سال کی ہوئی تو اس نے اسے گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل کروا دیا۔ وہ تیسری کلاس میں تھی جب اس کی استانی نے اسے سبق نہ آنے پر سزا کے طور پر 30 دفعہ اٹھک بیٹھک کی سزا دی تو وہ اس کے سکول پہنچ گیا اور استانی کے خوب کان کھینچ کر آیا۔ اس نے استانی سے صاف صاف کہہ دیا کہ میری نور کو سبق آئے یا نہ آئے اسے نہ تو کوئی سزا دے گا اور نہ کوئی ڈانٹے گا۔

☆☆☆

وہ کون تھا، کہاں سے آیا تھا، اُس کا نام کیا تھا، کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ شروع شروع میں لوگ اُسے "مندھ شیدائی" کہتے رہے جب وہ قبرستان چلا گیا تو اُسے قبرستان والا شیدائی کہنے لگے۔ پھر ایک دن انڈین ہیرو متھن چکرورتی کی فلم "چنڈال" آ گئی۔ اس فلم میں متھن اپنے سارے خاندان کے جھوٹے قتل کی سزا کاٹنے کے بعد جیل سے نکل کر شمشان گھاٹ چلا جاتا ہے اور "چنڈال" بن جاتا ہے۔ وہ رات کے وقت مردوں کی چتائیں جلاتا اور قبریں کھودتا اور دن میں اپنے خاندان کے قتل کا بدلہ لینے چلا جاتا۔ گاؤں میں یہ فلم بہت مشہور ہوئی۔ اگرچہ وہ دن کے وقت کہیں بدلہ لینے نہیں جاتا تھا، مگر اس کی چنڈال کے کردار سے مشابہت کی وجہ سے لوگوں نے اُسے شیدائی کی بجائے چنڈال کہنا شروع کر دیا، چند ہی دن میں اس کا یہ نیا نام پہلے معروف ہوا اور پھر پکا ہو گیا۔ جس نے چنڈال فلم نہیں بھی دیکھی تھی وہ بھی اُسے چنڈال کہنے لگا۔ اگر کسی نے چنڈال کو قبریں کھودنے اور اپنی گہری آنکھوں سے آسمان کو گھورنے کے علاوہ کچھ کرتے دیکھا تو وہ تھا بھنگ بناتے ہوئے۔ قبرستان میں بھنگ گنجانی میں اُگی ہوئی تھی جو اس ویرانے میں شاید اس کی واحد تفریح تھی۔ یہ شدت کیا تھی کیوں آتی تھی اس بارے میں کچھ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا لیکن جس دن اس کی

طبیعت میں شدت آتی وہ دو تین پیالے بھنگ پیتا اور مدہوش پڑا رہتا۔ اگر قبرستان میں بھنگ نہ ہوتی تو شاید وہ اکیلا پڑ جاتا۔ بھنگ پینے سے اُس کی گہری آنکھیں اور گہری ہو جاتیں اور پھر وہ لیٹ کر آسمان سے نجانے کیا تلاش کرنے لگتا۔

☆☆☆

رانے طیب کی طرف سے صاف جواب سننے کے بعد وہ پچھلے دو دن سے بھوکا تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ حافظ افتخار نے اس کے کچھ پیسے دینے ہیں جو اُس نے پچھلے سال سے لٹکائے ہوئے ہیں اور وہ تقریباً بھاگتا ہوا اس کی دکان پر پہنچا اور جاکر اس سے پیسوں کا تقاضا کر دیا۔ حافظ افتخار نے پہلے تو اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن جونہی اس کی آواز بلند ہوئی تو اس نے پیسے دے دینے میں ہی عافیت سمجھی اور عین اس وقت جب وہ گالیاں دینا شروع کرنے ہی والا تھا حافظ افتخار نے اسے 500 روپیہ نکال کر تھما دیا اور وہ اسے جیب میں ڈال کر تانگوں والے اڈے جا پہنچا جہاں سے اس نے چاچے بازی کی دکان سے مرغی کا سالن ڈال کر چاول کھائے اور وہیں سے اگلے پورے ہفتے کے لیے چرس خرید لی۔ بڑے دنوں کے بعد اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا اور جی بھر کر چرس پی تھی۔ اب اسے جہاں جانا تھا وہاں جانے کے لیے اسے رانے طیب کی ضرورت تھی لیکن اس سے تو وہ اس دن کے بعد قطع تعلق کر چکا تھا اور اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں بچے تھے۔ اسی بارے میں سوچتا ہوا وہ گاؤں سے باہر جانے والی سڑک پر پیدل ہی نکل گیا۔

☆☆☆

نور پرائمری کے امتحانات میں اچھے نمبروں سے پاس ہوئی تو اس نے اسے ساتھ والے قصبے کے ہائی سکول میں داخل کروا دیا۔ پہلا ایک سال تو وہ اسے خود چھوڑ کے آتا رہا لیکن پھر جب اس کی ترقی ہوئی اور اسے ساتھ والے شہر میں بلوا لیا گیا تو اسے دفتر کے لیے صبح صبح نکلنا پڑتا۔ اگرچہ نور نے کہا کہ وہ صبح صبح اُٹھ کر تیار ہو سکتی ہے لیکن اس نے کہا ''میری بیٹی سکول میں دو گھنٹے جا کر فارغ بیٹھی رہا کرے گی کیا؟ اور واپسی پر تو میں لیٹ آؤں گا تب؟'' اور نور کے لیے رکشے کا انتظام کر دیا۔ رکشے والا نور کو صبح سات بجے گھر سے لے جاتا اور دو پہر دو بجے اسے سکول سے واپس لے آتا۔ وہ اب بھی ہر روز آکر سب سے پہلے اپنی بیٹی کے ماتھے پر بوسہ دیتا اور شام کو بیٹھ کر اس سے سکول میں ہونے والے سب واقعات سنتا، نور کی نئی سہیلیوں کے بارے میں پوچھتا اور جب نور بتاتی کہ آج اس کی سہیلی گڈو نے اس کی ربڑ لے لی اور اس نے جب واپس مانگی تو گڈو نے نہیں دی تو پھر وہ اسے کہتا کہ ساری کلاس میری نور سے ربڑ مانگ کر مٹائے تو کچھ نہیں لیکن میری نور کبھی کسی سے ربڑ نہیں مانگے گی اور پھر اگلے دن اسے دو ربڑ دے کر سکول بھیجتا۔

☆☆☆

اُس کے ماضی کے متعلق مختلف روایات ملتی تھیں جن میں سے شاید کوئی بھی حقیقت کے قریب نہیں تھی۔ مولوی فلک شیر کا خیال تھا کہ چنڈال چالیس دن کا چلہ کاٹنے کے لیے کسی قبر میں گیا تھا۔ اُنتالیس دن تک تو وہ قبر میں رہا مگر چالیسویں دن چیخیں مارتا ہوا باہر نکلا اور اپنا گاؤں چھوڑ کر یہاں بھاگ آیا۔

ڈُلفی کے ٹو سگریٹ کا ایک لمبا سا کش بھرتا اور بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ عمران مہر سے کہتا'' باؤ عمران! بیچارے چنڈال کو بھی میری طرح فوج کا بڑا افسر بننے کا شوق تھا مگر ظالم وقت نے اُس کے سارے خواب بکھیر دیئے۔ باؤ عمران یہ وقت بڑی ظالم چیز ہے یار، برا ہو تو گزارے نہیں گزرتا اور اچھا ہو تو عمُریں گزر جاتی ہیں یہ نہیں آتا، اس کی لگی سَٹ ساتھ لے کے چلنا بڑا ای مشکل ہوتا ہے پھر کوئی چنڈال بن جاتا ہے تو کوئی میری طرح کے ٹو سگریٹ کو اپنا سہارا بنا لیتا ہے۔

ماسی مجیداں کے مطابق چنڈال کی بیوی ایک بہت ہی معصوم اور سیدھی سادھی خاتون تھی بالکل ماسی ہی کی طرح مگر اُس کی بہو انتہائی شاطر اور لڑاکا عورت تھی جو کہ اکثر چنڈال کی بیوی کے ساتھ لڑتی رہتی تھی۔ ایک روز دونوں

دونوں کی تکرار طول پکڑ گئی اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ بہو نے ساس پر ڈنڈے سے حملہ کرنا چاہا، چنڈال انہیں چھڑانے کے لئے آگے بڑا مگر شومئ قسمت سے ڈنڈا اُس کے سر پہ آ لگا اور یوں چنڈال کا ذہنی توازن جاتا رہا۔

☆☆☆

دو تین پکے سگریٹ پینے کے بعد اس کی آنکھوں سے جیسے دھواں نکل رہا تھا، ٹانگوں میں جان آ گئی تھی اور دماغ تیز تیز کام کرنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں خارش ہو رہی تھی جو اسے برائی پر مسلسل اکسائے جا رہی تھی۔ اتنے دنوں بعد پیسے ہاتھ تو آئے تھے مگر چرس کی طلب نے اسے پاگل سا بنا دیا تھا تبھی تو اس نے جذباتی ہو کر سارے پیسوں کی چرس ہی خرید لی تھی۔ دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے اور وہ لڑکھڑاتا ہوا شرقی قبرستان کے ساتھ والی خالی سڑک پر چلتا جا رہا تھا۔ دور اسے کچھ حرکت سی نظر آئی لیکن وہ اس سے بے نیاز چلتا رہا۔ تھوڑا آگے جا کر اسے پتہ چلا کہ وہ ایک دس بارہ سال کی بچی تھی جو اس کڑی دھوپ میں اپنا بھاری بستہ کمر پر لٹکائے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ بچی کو پہلی نظر دیکھ کر اسے جو خیال آیا اسے اس کے غلاظت سے بھرے ہوئے دماغ نے بھی رَد کر دیا لیکن وہ نشہ ہی کیا جو انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج نہ کر دے۔ وہ فرشتوں سی معصوم اور نئی پھوٹتی ہوئی کونپل جیسی نازک بچی جب اس کے قریب پہنچی تو اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اس تپتی دوپہر میں وہاں اور کون ہو سکتا تھا۔ دور کہیں کھیتوں میں کوئی کسان شاید پانی لگانے جا رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے منہ میں جمع تھوک نگلی اور اپنے اندر کی ساری شیطانیت اکٹھی کر کے اس بچی کو دبوچ لیا۔ بچی کے سر کے پیچھے سے لا کر ایک ہاتھ سے اس نے بچی کا منہ بند کیا اور دوسرے ہاتھ سے بچی کی دونوں ٹانگوں کو مضبوطی سے جوڑ کر اُٹھا کر ساتھ والے قبرستان کی طرف دوڑ لگا دی۔

☆☆☆

اُس نے بیل بجاتے ہوئے موبائل فون کی سکرین پر نظر ڈالی تو اس پر چاند پی سی او کا نمبر تھا۔ چاند پی سی او اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا۔ کلثوم عموماً اسے تبھی فون کرتی جب اچانک مہمان آ جاتے اور ان کے لیے واپسی پر گوشت لانے کا کہنا ہوتا، یا پھر جس دن محلے میں کوئی مرگ ہو جاتی اور اس کا جنازہ عصر کی نماز کے فوراً بعد ہوتا۔ ''رب خیر ای کرے'' کہتے ہوئے اس نے ہرا بٹن دبایا اور فون کان سے لگایا۔

''نورا ابھی تک گھر نہیں پہنچی'' کلثوم کی آواز میں پریشانی نمایاں تھی۔

''زاہد کا رکشہ خراب ہو گیا ہو گا اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے'' اسے یہ بات کہتے ہوئے وہ خود اس سے کہیں زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔

''زاہدا بھی آیا ہے، وہ کہہ رہا ہے راستے میں کوئی ہڑتال تھی، مجھے سکول پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی، جب پہنچا تو نور وہاں سے نکل گئی ہوئی تھی'' کلثوم تقریباً رو پڑی۔

''او شیدائن نہ بنو! میں ابھی پتہ کر لیتا ہوں، ادھر ہی ہو گی، رستے میں ٹریفک نہ رک گئی ہو کہیں'' کلثوم کی بات سُنے بغیر ہی اس نے فون بند کیا اور جس ہاتھ سے فون جیب میں ڈالا اسی ہاتھ سے موٹر سائیکل کی چابی نکال کر دفتر سے نکل آیا۔

اس نے سارا شہر کھنگال ڈالا۔ شہر میں مہنگے مشروبات کے بڑے اور رنگین بورڈز تھے۔ جن کے نیچے سے جب کوئی سائیکل یا گدھا گاڑی پر سوار شخص گزرتا جس کے پاس مشروب خریدنے کی استطاعت نہ ہوتی، تو بورڈز پر چھپی چھوٹے چھوٹے کپڑوں میں ملبوس خوبصورت اور جوان لڑکیاں اسے دیکھ کر ہنسنے لگتیں۔ شہر میں حکومت کی ناقص کارکردگی اور فرسودہ نظام کے باغیوں کی ریلی تھی جس کے پُرامن کارکن ہر اُس شخص کو حکومت کا ساتھی سمجھ کر مار

رہے تھے جوان کے ساتھ مل کر نعرے نہیں لگا رہا تھا، شہر میں سڑک کے بیچ کھڑی پھل والی ریڑھیاں تھیں جہاں لوگ گلے سڑے پھل بیچ کر اپنے بچوں کے لیے حلال رزق کما رہے تھے، شہر میں پوں پوں پاں پاں کرتی لمبی لمبی گاڑیاں تھیں جن میں بیٹھے لوگ بے وجہ جلدی گھر پہنچنے کو بیتاب، اشارے توڑ رہے تھے۔ شہر میں ٹریفک پولیس کے اہل کار تھے جو دھوپ سے بچنے کے لئے اشاروں کو اللہ کے حوالے کر کے چھاؤں میں بیٹھے گپیں مار رہے تھے۔ شہر میں گڑھے تھے جن میں بارش کا گندا پانی جمع تھا۔ شہر میں دیواریں تھیں جو حکیموں اور ڈاکٹروں کے اشتہاروں سے اٹی ہوئی تھیں۔ شہر میں ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ڈرائیور اور سواریوں کے پیچھے بھاگتے کنڈکٹر تھے۔ شہر میں دھوپ تھی، گرمی تھی، شور تھا، دھول مٹی سب کچھ تھا، لیکن نور کہیں نہیں تھی۔

سارے شہر کی خاک چھان کر جب وہ گاؤں پہنچا تو قبرستان والی سڑک پر کافی لوگ جمع تھے۔ ''شاید کوئی مر گیا ہے آج'' یہ سوچتے ہوئے جب وہ لوگوں کی اس بھیڑ کے پاس سے گزرنے لگا تو ''دس بارہ سال کی بچی تو ہوگی'' کے الفاظ اس کے کانوں میں پڑے۔ بے ساختہ اس نے دایاں پاؤں دبا دیا۔ اتنے میں ارشاد کھو کھر دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور بولا ''یار وہ بچہ کہہ رہا ہے اپنی نور تھی۔ ایم...... ایمبولینس آئی تھی، سول ہسپتال لے گئے ہیں'' اس کے بعد ارشاد کی آواز اس کے کانوں کے اندر اُترنا بند ہوگئی، اُسے اُس کے ہونٹ ہلتے دکھائی دے رہے تھے، ''جاؤ..... ہم.... کلثوم..... نور..... زخمی......'' اس نے ارشاد اور کئی دوسرے لوگوں کے ٹوٹے پھوٹے دو چار لفظ سنے اور سول ہسپتال کی طرف اُڑتا ہوا نکل گیا۔

کلثوم کو ہسپتال کے درجنوں چکر اور کاغذات پر انگوٹھے لگانے کے بعد نور کی لاش تو مل گئی لیکن نہ اس کا بستہ ملا اور نہ ہی اُس کے باپ کا کچھ پتہ۔

آج صبح سے ہی اس کی طبیعت میں وہی انجان سی شدت تھی۔ اس نے اپنے سخت ہاتھوں سے بھنگ کے اتنے پیالے پیے جتنے وہ پی سکتا تھا۔ کچھ دیر میں گاؤں سے ایک 40 سے 45 برس کا ایک شخص بڑے نپے تُلے قدم اُٹھاتا ہوا قبرستان میں داخل ہوا۔ آہستہ آہستہ چلنے والا یہ شخص جانتا تھا کہ لوگ اُسے چنڈال کے نام سے بُلاتے ہیں مگر وہ اُس کے پاس آکر رُک گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُسے کیا کہہ کر بُلائے، مندھ، سائیں یا پھر چنڈال۔ اتنے میں اس بزرگ کے پیچھے ایک نوجوان دوڑتا ہوا پہنچا اور ساتھ آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نوجوان کے قدموں کی آہٹ سے چنڈال اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بزرگ نے ایک نظر اس بعد میں آنے والے نوجوان کی طرف دیکھا اور پھر چنڈال سے مخاطب ہوا، ''میاں ایک قبر کھودنی ہے۔ مم..... میری..... میری بیٹی فوت ہوگئی ہے'' اس نے کچھ توقف کیا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو ''14 برس کی تھی میری بیٹی۔ لگ بھگ اس.... اس نوجوان کے برابر قد ہوگا اس کا'' بعد میں آنے والے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس شخص نے کہا جس کے جواب میں چنڈال نے اپنی گہری آنکھیں نوجوان پر ڈالنے کے بعد زمین میں گاڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور پھر وہ شخص چنڈال کو قبر کھودنے کی جگہ بتا کر اس نوجوان کے ساتھ ہی قبرستان سے چلا گیا۔

جب وہ قبر کھودنے لگا تو گاؤں کے دو چار جوان آکر اس کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ سارے چرس والے سگریٹ سلگا کر آپس میں گپیں مار رہے تھے اور چنڈال ان سے بے نیاز سخت اور خشک زمین میں کدال چلائے جا رہا تھا۔ قبروں کے درمیان بل کھاتے ہوئے تنگ راستے پر سائیکل چلاتا ہوا عابد قریشی اپنی مستی میں چلا آ رہا تھا۔ اس نے جب چنڈال کو قبر کھودتے دیکھا تو رُک کر ان جوانوں سے پوچھنے لگا ''نومی بادشاہ کون فوت ہو گیا ہے؟'' ''چاچے شفیع مہر کی بیٹی'' ''شفع مہر پنساری؟'' ''ہاں ہاں وہی.... پاعابد یار! بے چاری کے ساتھ کوئی زیادتی کر کے لمبڑوں کے کھیتوں میں پھینک گیا تھا، ادھر ہی دم توڑ گئی ملوکڑی'' عابد قریشی تو ''یااللہ معاف کرنا'' کہہ کر چلا گیا مگر چنڈال کے کبھی نہ تھکنے والے ہاتھ رُک

گئے۔ پہلے اُس کے ہاتھ کانپنا شروع ہوئے اور پھر پورے جسم میں کپکپی پھیلنے لگی۔ جب اُس کے ہاتھ سے کدال زمین پر گری تو پاس بیٹھے جوانوں میں سے ایک اپنا چرس والا سگریٹ پھینک کر جلدی سے آگے بڑھا لیکن چنڈال کے پاس جا کر رُک گیا۔ چنڈال کے ہونٹ ہلکے ہلکے ہل رہے تھے مگر آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ کپکپی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک جوان نے آگے بڑھ کر اُس کی بات سُننے کی کوشش کی ''مے.... مے.... میر.... ن.... نو.... نو.... نور'' کے بعد اس کا جسم اس شدت سے کانپا کے سب کے سب ڈر کر اس سے دور ہٹ گئے۔ پھر چنڈال کے منہ سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی جو پورے قبرستان میں گونج گئی اور اسی گونج کے ساتھ وہ نیچے گر گیا۔ اپنی آنکھوں سے بھی زیادہ گہری قبریں کھودنے والا آج ایک اَدھ کھدی قبر میں بے جان پڑا تھا اور اس کی قبر کھودنے والا کوئی نہیں تھا۔

ثمینہ سید

ادھوری کہانیاں

کچھ لوگ بہت بے وقوف ہوتے ہیں۔ بہت حساس، انتہا کے بدبخت، اپنوں سے غیروں سے محبت کرنے والے، ہر آہٹ کو سماعتوں میں اترتا محسوس کرنے والے، گلی کے ذروں کو بھی عزت اور محبت سے دیکھنے والے۔ پھر اپنے بہت قریب والے لوگوں کی نظر انھیں پہچان کیوں نہیں پاتی؟ وہ جھوٹے اور بے وفا سمجھے جاتے ہیں۔ بات سمجھنے تک ہی نہیں رہتی، ان بے پناہ اور بے لوث محبتوں کی بنیاد پر دھتکار دیئے جاتے ہیں۔ شاید زیادہ قربت نے ان کے نقش دھندلا دیئے ہوں یا پھر انھیں اپنی بات کہنی اور سمجھانی ہی نہیں آتی۔ اسے سب یاد تھا بالکل تروتازہ، صاف آوازیں، غصے کی شدت سے بھرے چہرے، شوہر کی غراہٹوں سے لے کر بچوں کی کلکاریوں تک اور بچوں کی کلکاریوں کے غراہٹوں میں بدلنے تک سب۔ وہ لاحاصل وجود اور دشت زدہ سی صورت بنائے لہروں کو تک رہی تھی۔

''کیا لہریں بات سنتی ہیں؟ میں جو یہاں کھڑی ان کے ساتھ وقت بتا رہی ہوں تو انھیں میرے قیمتی وقت کی کوئی قدر ہو گی؟ اگر واقعی ہو گی تو پھر انسانوں کو کیوں نہیں ہوتی۔ ہمارے وقت کی، محبت کی، ریاضت کی، آنکھوں میں ٹھہرے پیار کی، ہم سے جڑی یادوں کی، ہمارے بھاگتے دوڑتے قدموں کی، ہمارے ہنستے روتے لہجوں کی، ہمارے ارد گرد بکھری بے شمار چیزوں کی۔ چیزیں بھی تو چیختی چلاتی ہیں۔ جانے والے کو آوازیں دیتی ہیں۔ ان کی آواز سماعتوں تک کیوں نہیں پہنچتی؟'' وہ سراپا سوال بنی لہروں کو گھور رہی تھی۔ ''کیا ہر دور میں مجھ جیسے بدبخت لوگوں کو پیٹ پہ پتھر باندھ کے لہروں میں پناہ لے لینی چاہیے؟''

وقت بھی اس کی محسوسات کی طرح ساکت تھا۔ سہا ہوا، منجمد، حرکت میں تھی تو ہوا یا پھرنا چاہتے ہوئے بھی اس کا دل۔ ہوا کے تند بگولوں سے نہ صرف بال اڑ رہے تھے، کپڑے اڑ رہے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا تلخی بھی تحلیل ہو رہی تھی۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔ سمندر کی لہروں کو چیخ چیخ کے بتانے لگی ''ابا نے اپنی مرضی سے مجھے پڑھایا، ڈاکٹر بنا دیا، پھر اپنی مرضی سے میری شادی کر دی۔ واسطے دیتے تھے ہر بار ''میرا مان رکھنا نبھانا۔ تم میں جان ہے میری'' نبھایا میں نے۔ شادی کے تمام لوازمات نبھائے۔ شوہر بچے اور.... اور لکھا بھی ساتھ ساتھ۔ اپنا شوق صرف لکھنا تھا۔ اپنی ہی کہانیوں کو تصویر کرنا بھی الگ روگ تھا۔ کہانیاں چھپتی رہیں، نام بنتا رہا۔ تصویروں سے میرا کمرہ، میرا اسٹور روم بھرتا گیا۔ میں تخلیق کے عمل سے گزرتی تو شانت ہو جاتی۔ تم بھی تو ہوتے ہو گے نا! کبھی کبھی شانت، پرسکون لیکن میرے اندر بھی تمھاری طرح اضطراب کی شرح زیادہ ہے۔ ہر وقت ہاتھ اور دماغ چلتے رہتے ہیں۔ میں نے ان سارے کاموں کے ساتھ اپنے بچے پوری محبت سے پالے۔ ایک پل بھی ان کا نہیں گنوایا۔ کچھ بھی ضائع نہیں کیا۔ مجھے عبید سے محبت نہیں تھی، بالکل نہیں ہے۔ کبھی ہوئی ہی نہیں۔''

زینیا ٹھنڈی گیلی ریت پر ڈھے سی گئی۔ بیٹھی تو جیسے سکون ملا۔ دکھوں پہ رونا اور کہہ دینا تو بہت بڑی نعمت تھی یہ اسے آج ہی پتہ چلا۔ سر دپر شور ہوا اس کی ہڈیوں سے درد چھننے لگی۔

''مرنے آئی تھی تیرے پاس، پناہ لینے اور تو ماں کی گود کی طرح مجھے لگنے لگا ہے۔ میرے قصے سننے بیٹھ گیا ہے''
وہ سمندر کو دیکھ کے خفگی سے بولی۔

زینیا عبید اللہ کو عبید اللہ سے الگ ہوئے پندرہ سال گزر گئے تھے۔ وہ اس سے دوگنی عمر کا ڈاکٹر عبید اللہ اسے پہلے دن سے خبطی عورت سمجھتا تھا۔ دن میں ہزار بار بتاتا ''تم ڈاکٹر ہو یہی پروفیشن ہمارا خاندانی پروفیشن ہے لیکن تم اندر سے نالائق عورت، ان کاغذوں میں الجھی رہتی ہو پاگل۔ چاچو کو تمھیں میڈیکل میں لانا ہی نہیں چاہیے تھا لیکن وہ پدری شفقت میں تمھارے اندر کی یہ فضول خبطی عورت نہیں دیکھ سکے، سب ضائع کر دیا۔''

زینیا کے دماغ میں کہانیاں پرورش پاتیں یا کوئی تصویر اٹک جاتی تو اسے یہ سب لغویات سنائی ہی نہیں دیتی تھیں۔ وہ چیخ چلا کے چلا جاتا تو وہ اپنے لمبے گھنے بال سنوارتی، خود کو شیشے میں دیکھ کے مسکراتی اور اپنی لکھنے والی میز کو ترتیب دینے لگتی۔ پھر کرسی کھینچ کے بیٹھ جاتی اور کہانیاں قرطاس پہ اترنے لگتیں۔ سارے ملال دھل جاتے۔ ملک کے بہترین شماروں میں اس کی کہانیاں چھپنے لگیں۔ وہ عملی طور پہ ادب کے میدان میں اترنے لگی تو عبید اللہ کا غیظ و غضب بڑھنے لگا۔ وہ چیختا چلاتا، گالی گلوچ کرتا اور کبھی تو اس کے قلم کتابیں اٹھا اٹھا کے پھینکنے لگتا۔ وہ روہانسی سی تہذیب زدہ عورت سہمی ہوئی بیٹھی رہتی۔ بچے بھی رونے لگتے۔ اب تو بیٹا ان دونوں کی لڑائی میں چیخنے لگتا، چیزیں اٹھا اٹھا کے پھینکنے لگتا۔ نجانے کونسا لمحہ تھا جب وہ رامش کو سنبھالتے سنبھالتے نڈھال ہونے لگی تو پلٹ کر بولی:

''عبید اللہ مجھے طلاق دے دو، بس بہت ہو گیا''

''کوئی یار مل گیا ہو گا ادب کی دنیا میں!'' وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ نفرت سے بھرپور نظریں اس کے چہرے پہ گاڑ کے بولا۔

''تم اتنے پڑھے لکھے ہو، مہذب اور میں جاہل، میرے اندر اب تمھارے لیے نفرت اور غصہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ہم کوئی بہت بڑا نقصان کر بیٹھیں گے۔ مجھے لگتا ہے یہی بہتر ہے۔ ابا کو کہنا میں بدکردار ہوں، جاہل اور بدزبان۔''

''ابا کو کیا ساری دنیا کو بتاؤں گا۔ تمھیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔ بہت بڑی ادیبہ، مائی فُٹ! میں عبید اللہ صفی تمھیں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔ اور رہو تم اس گھر میں اپنے کاٹھ کباڑ اور اپنے جیسی ذہنی مریض اولاد کے ساتھ۔'' عبید اللہ پاؤں سے کئی چیزوں کو ٹھوکریں مارتا نکل گیا۔ بچے اس کے وجود کے ساتھ چپکے ہوئے تھے لیکن رو نہیں رہے تھے۔ وہ دونوں بیٹوں کو ساتھ لگائے بیٹھی رہی سکون سے۔ رونا دھونا ختم ہو گیا تھا لیکن اس کا بھرم نجانے کس نیکی کے صلے میں رہ گیا۔ کچھ ہی گھنٹوں بعد اطلاع ملی کہ ڈاکٹر عبید اللہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں جان کی بازی ہار گیا۔ یہ تھی وہ جان، وہ ڈگریاں، وہ جاہ جلال جو سب فنا ہو گیا۔

زینیا نے ہونٹ سی لیے۔ بچوں کو بھی سمجھایا:

''جو اس دنیا سے چلے جاتے ہیں ان کی برائی نہیں کرتے۔ بس بالکل خاموش رہنا ہے۔ کسی کو بھی اپنے گھر کی بات بتائیں گے تو لوگ مزہ لیں گے، مذاق اڑائیں گے۔ بس یہ چیپٹر کلوز'' دونوں بیٹوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

زندگی کی پوری ہیئت ہی بدل گئی۔ پیٹ کی اور بچوں کی تعلیم کی ضرورتوں نے اپنا آپ منوا لیا تو زینیا ڈاکٹر زینیا بن گئی۔ یہی تعلیم تھی لہٰذا یہی پیشہ اپنا لیا۔ معمولات قابل فہم ہونے لگے تو پھر قلم اٹھا کے بیٹھ گئی۔ انھی لفظوں نے شاید اس کا بھرم رکھا تھا۔ ان سے تو کسی صورت دستبردار نہیں ہو سکتی تھی۔ لکھتے، پڑھتے، کام نپٹاتے، بچوں کو انسان بناتے، وہ بھاگتی رہی۔ سب بہت مشکل تھا لیکن سکون اور عزم کے ساتھ ہوتا گیا۔ اس نے اپنے اور بچوں کے درمیان کسی کو نہیں آنے دیا۔ محبتیں نہ جذبات، چار دیواری کو مزید مضبوط بنا لیا۔ ابا نے نوکر چاکر رکھ دیئے تھے اور خود بھی آتے جاتے،

بچوں کی تربیت پر مکمل نظر رکھتے۔

محبت بہتے رواں پانی کی طرح ہے، بندے کی ذات میں کب راستے بنا لیتی ہے، خبر بھی نہیں ہوتی لیکن الجھن میں ضرور ڈال دیتی ہے کہ اب کیا کیا جائے؟

بچے بڑے ہو رہے تھے۔ نانا اور ماں جیسے ڈاکٹرز کی تربیت میں بہت اچھے ڈاکٹر بن رہے تھے۔ پھر رامش سپیشلائزیشن کے لیے امریکہ چلا گیا اور ساحر کو جاب ملتے ہی شادی کا شوق چرانے لگا۔ وقت کو پر لگے ہوئے ہیں، کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ نہ ہی آپ ایک لمحہ بھی اپنی مرضی کا بنا سکتے ہیں۔ سب زینیا کو احساس دلاتے رہتے کہ تم بہت خوبصورت ہو، جوان ہو اپنے بارے میں بھی سوچو لیکن وہ تو ماں تھی بس! اس کے سوا اپنے وجود کا کوئی دوسرا مصرف نہیں سوچا تھا۔ جو محبت زندگی میں تھی بھی، اس سے سہارے کی توقع نہیں تھی۔

کیا جانیے کب دھوپ کی آغوش میں دے دے جس شخص کا سایہ مجھے بادل کی طرح ہے

ادب میں کوئی منزل تھی نہ مقام، بس لفظوں سے کھیلنے کا چسکا جوئے کی لت جیسا لگا ہوا تھا۔ وہ اپنے ارد گرد بہت سی ادیب و شاعر خواتین کو تنہا ہی زندگی گزارتے دیکھ رہی تھی۔ ایسے میں مسکرا کر شکر کرتی کہ چلو اپنی زندگی کی باگ ڈور چلانے کے وسیلے تو ہیں نا! باعزت وسیلے اور اولاد بھی الحمدللہ!

پیشہ ورانہ مصروفیات اور ادبی کانفرنسوں اور تقریبات کی مصروفیات نے اسے تھکا کے رکھ دیا تھا۔ کبھی ادبی چپقلشیں، سازشیں بیزار کر دیتیں۔ وہ دیکھ رہی تھی ہر چیز میں منافقت ہے، اقربا پروری یا پھر اپنی جگہ بنانے کے لیے، نظر آنے کے لیے جھوٹے سچے معاشقے۔ وہی لوگ ادب کے افق پہ جگمگا رہے تھے جن کے دامن جتنے زیادہ آلودہ تھے۔ کردار جن کا مسئلہ ہی نہیں تھے اور پیار محبت، عزت سب قدریں منافقت کی نذر ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھار تو دل ان تمام چیزوں سے اچاٹ ہو جاتا اور زینیا خود کو تنہا کر لیتی، تبھی اس پہ کھلتا ہر رشتہ زندگی کا کہ ہر میدان کارزار ہے، گرم ریت پہ ننگے پاؤں بھاگنے جیسا۔ اس کی پانچ کتابوں نے کوئی کمال کیا نہ ہی دو ڈاکٹر بیٹوں نے بہت اہمیت اور عزت دی۔ ایک لمبا اور تھکا دینے والا سفر شل کر رہا تھا۔ اسے لگنے لگا سارا جیون بیکار گزرا ہے۔

رہتے ہیں سفر میں ہمیں عادت ہے سفر کی یہ بھول گئے ہیں کہ کیا غائت ہے سفر کی
ملتے ہی نہیں حرف و صدا اتنی تھکن ہے جو بات بھی کرتے ہیں وہ بابت ہے سفر کی

اس نے لکھ کے ڈائری بند کر دی۔ آج رات کی ڈیوٹی تھی، ڈائری بیگ میں ڈالی اور فرصت کے چند لمحے آنکھیں موند کر سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

رامش آ رہا تھا، وہ ساری فیملی کے ساتھ امریکہ شفٹ ہونا چاہتا تھا۔ زینیا نے تو اپنی مٹی سے الگ ہونے کا کبھی سوچا تک نہ تھا۔ وہ کئی بار رامش کے پاس جا چکی تھی لیکن ہمیشہ کے لیے اپنے وطن سے چلے جانا اور ابا کو عمر کے اس حصے میں چھوڑ کر جانا زینیا کے لیے کسی طور ممکن نہیں تھا۔ رامش نے آنے سے پہلے ہی بتا دیا:

''ساحر کی اپنی فیملی ہے، وہ سب میری ذمہ داری نہیں ہیں۔ صرف میں اور آپ جائیں گے۔ شادی کے تمام انتظامات کر کے آ رہا ہوں۔ آپ کا شادی میں ہونا ضروری ہے۔ اور ہاں! یہ اپنے کتابوں کاغذوں کے پلندے بند کر کے وہیں چھوڑ دیں اس سب کی گنجائش نہیں ہے۔''

زینیا کو ادراک ہوا کہ تربیت یا میری محنت اور محبت سے کہیں زیادہ ان کے گندے اور کٹھور خون کا اثر طاقت ور ہے۔ وہ ریت کی دیوار کی طرح مسمار ہو گئی تھی۔ گھنٹوں چپ رہی پھر موبائل اٹھا کے رافیل کا نمبر ملانے لگی۔ محبت پہ بھی آزمائش کا وقت آخر آ ہی جاتا ہے۔ رافیل کو اپنے سارے دکھ سنانے لگی۔ رامش اور ساحر کے رویے ایک نہایت بڑی اور

کامیاب عورت کی کھوکھلی جڑیں دُکھانے لگی، روتی رہی پھر فیصلہ کن لہجے میں بولی:

''تم نے ہمیشہ مجھے اپنانے کی بات کی ہے نا! چلو ہم دنیا کی پرواچھوڑتے ہیں، اپنی محبت بچا لیتے ہیں۔''پورا یقین تھا اس کے لہجے میں، پورا مان۔

''ہاں میں کب پیچھے ہٹ رہا ہوں، نکاح کر لیتے ہیں۔ تم مت رہو بیٹوں کے ساتھ، نکال دو انھیں اپنے گھر سے، میں آتا جاتا رہوں گا۔ یار تم میرے مسائل سے واقف ہو۔ جب ہم ملے تھے تب سے شادی، بچے سب ایسا ہی تھا۔ بتاؤ کیا کہتی ہو''

''نہیں! شادی کے لیے ''نہیں'' کہہ رہی تھی۔ وہ بکھرے وجود کے ساتھ اپنا بھرم سمیٹنے لگی۔

''بچوں کو کیسے نکال سکتی ہوں؟ ان کے باپ کا گھر ہے اور محبت پا کر اکیلے ہی زندگی گزارنی ہے تو.......''فون بند کر دیا اس نے اور جنونی کیفیت میں سارے کاغذ اور لیپ ٹاپ سمیٹ کے کونوں میں لگانے لگی۔

اب گیلی ریت پہ بیٹھی سارے راز اگل دیئے۔ ذہن میں سب کی زندگیاں، سب کے اپنے اپنے گھر چل رہے تھے۔ روتی رہی، خود کو لہروں کے حوالے کرنے کی ہمت بندھانے لگی۔ اٹھ کے سمندر کے سامنے ڈٹ کے کھڑی ہو گئی، سانس کھینچی تو نجانے کہاں سے کاغذوں کی خوشبو، کتابوں کے ٹائٹل، ادھوری تصویریں اور ڈھیروں قلم طاقت بن کے اسے کھینچنے لگے۔ وہ پوری آنکھیں کھولے یہ تماشا دیکھتی رہی۔

''سب اپنی اپنی زندگی جی رہے ہیں زینیا! تو تُو کیوں ہار رہی ہے؟ جھوٹے دنیاوی سہارے تجھے دھوکا کیوں دے رہے ہیں؟ اس لیے کہ تو دھوکا کھا رہی ہے۔''

''یہ دیکھ زینی تیری کہانی چھپی ہے۔ میں نے لفافے کے اوپر سے بھی تیرا نام پھاڑ کے سنبھال لیا۔ میری جان کہیں زمین پہ نہ گر پڑے۔ یہ نام تو ہمیشہ زندہ رہے گا میری زینیا احمد کا نام''اماں کی کھنکتی آواز نے اس کے مردہ وجود میں جان ڈال دی۔ وہ اپنی ماں کی اکلوتی قیمتی تخلیق تھی۔ یہ آواز اسے حصار میں لے کے لہروں سے دور لے آئی جہاں بہت سی ادھوری کہانیاں اس کی منتظر تھیں۔

امیر حسین

غزل

خواب در آئے ہیں وحشت کی نمویابی کو
اور میں بیدار ہوا دیکھنے سیرابی کو

مجھ سے پوچھے کوئی آئینے میں کیا ہوتا ہے
میں جنوں زاد کہ باہم رہا بے تابی کو

موجِ خُوں سر سے گزرتی ہے تو تب دیکھتا ہوں
آتشِ عشق لیے اُس دلِ سیلابی کو

بحثِ موجود و میسر میں نہ شامل رکھیے
اک غنیمت ہی سمجھیے مری کمیابی کو

در حقیقت تو یہ آنکھوں کا زیاں ہے میری
آپ نے خواب سمجھ رکھا ہے بے خوابی کو

آپ کی طبعِ خزاں ہم پہ برستی ہے بہت
ہم نے مضمون کیا موسمِ شادابی کو

جاوید عادل سوہاوی

غزل

درِ مکمل پہ آدھا پونا پڑا رہے گا
میں جب نہ ہوں گا تو میرا ہونا پڑا رہے گا

لپیٹ لوں گا میں نیلی چادر کے رنگ خود پر
مرا یہ خاکستری بچھونا پڑا رہے گا

یہ زندگی دودھ پیتی بچی نہیں ہے جس کا
جہاں گرے گی وہیں کھلونا پڑا رہے گا

یہ شہر قامت بڑھا رہا ہے، میں سوچتا تھا
پہاڑ کی گود میں یہ بونا پڑا رہے گا

مجھے یقیں ہے سماعتوں میں جو مقبرے ہیں
انھی کے چوگرد میرا رونا پڑا رہے گا

فرزاد علی زیرک

غزل

صبر کا ذکر چلا اور گھڑی ٹوٹ گئی
کوئی امید کسی دل میں پَڑی ٹوٹ گئی

کار، سگنل پہ کھڑی ہو تو کوئی بات چلے
کون مٹیار کے پھولوں کی لڑی ٹوٹ گئی

میں وہ بیٹا ہوں جسے باپ کی ہمت نہ ملی
اور جو چیز ملی، یعنی چھڑی، ٹوٹ گئی

سانس اک عام سے وعدے کے سبب ٹوٹ گیا
نیند اک سانس کی دُوری پہ کھڑی ٹوٹ گئی

فائدہ کچھ تو ہوا اس کے پلٹ جانے کا
کھلے دروازے کی بے کار کَڑی ٹوٹ گئی

کامران نفیس

غزل

دل میں آنکھیں رکھ لینا، یا آنکھوں میں یہ دل رکھنا
جتنا بڑا سمندر ہو تم اتنا ہی ساحل رکھنا

خود ہی اک تصویر بنانا، شہرِ محبت کی، جس میں
رستے بھی دشوار بنانا، چلنا بھی مشکل رکھنا

رنگ بھروں میں، اس تصویرِ شہرِ محبت میں، اور تم
رات کی کالک کم نکلے تو اپنے لبوں کا تل رکھنا

جس کی ڈال پہ زرد نبولی میٹھی ہونے والی ہے
رستے میں اک پیڑ ملے گا، وہ اپنی منزل رکھنا

مجھ سے ملنے رات بگولے کمرے میں آ نکلے تھے
میں نے بھی پھر سوچ لیا اب خود کو کیا حائل رکھنا

بالوں میں اک پھول سجا کر، خوشبو کو پھیلا دینا
ایک طرف تنہائی رکھنا، ایک طرف محفل رکھنا

مہناز انجم

غزل

عافیت کی بات سنتی اور اشارہ دیکھتی
بھیڑ میں آنے سے پہلے میں کنارہ دیکھتی

دھوپ کو زنجیر پہنانے کا لمحہ آ گیا
پہلے کھڑکی کھولتی پھر ابر پارہ دیکھتی

اک دفعہ دیکھے ہیں میں نے آرزو کے کاغذات
وقت مل جاتا تو میں اِن کو دوبارہ دیکھتی

یہ محبت اور کیا ہے پیاس کی چھلنی تمام
فائدے سے دل الگ کرتی خسارہ دیکھتی

سسکیاں بھرتا ہے پلکوں کے کناروں پر نمک
میں ابد تک آ گئی ہوں یہ ستارہ دیکھتی

پانیوں کے اس طرف کے سبز پن کی خیر ہو
ناؤ کی خواہش میں کیا پیڑوں پہ آرا دیکھتی

ارسلہ خالق

مٹیالی

کانوں میں پیتل کی میلی جھمکیاں
مٹیالا گھگرا
ناک میں وسواس شاہ کے میلے سے خریدی لونگ
جس کا نگ جانے کیوں دمکتا ہے
مٹیالی سر پر مٹی کی گاگر اٹھائے
روز پورب سے پچھم کو جاتی ہے
گاگر میں خواب ہیں
بسنتی چنری کے
راج کماروں کے
بستی میں چاروں طرف دھان کے خواب ہیں
بچپن سے سلائیاں بھر بھر آنکھ میں لگائے گئے خواب
جن سے مٹیالی کی آنکھیں روشن ہیں
لونگ کے نگ کی طرح
گھسے ہوئے کھڈی کے دوپٹے کی اوٹ سے جھانکتی، کھلکھلاتی ہنسی روشن ہے
جانے کون ہے
جس نے اندر سے ہانک لگائی ہے
روشن جبین پر ستاروں کی ماتھا پٹی باندھنے
کوئی آتا ہی ہے
ہائے مٹیالی کی روشن آنکھوں کو،
سونے کے بھاؤ بکتے خوابوں کو،
کوئی آئینہ مت دکھاؤ
کہیں ایسا نہ ہو کہ بالوں کی چاندی
دنداسے کا حسن چاٹ لے!

حفیظ تبسم

پتھر کا ہاتھی

(نیّر مصطفی کے لیے)

گھومتی ہوئی زمین نے اسے اچھال دیا
نواب صادق کے غرقاب ہوتے ہوئے شہر میں
اور وہ پالتو جانور کی طرح یوں بیٹھ گیا
جیسے آخری سانس تک وفاداری کا حلف دیا ہو

وہ کبھی کبھار آگ کے جوتے پہن کر
دریائے ستلج کے کنارے چہل قدمی کرتا ہے
ریت کی گہرائیوں میں وجود تک اتر کر کہتا ہے:
"اے دریا،
کون جان سکا ترے چھپے خزینوں کو
دیکھنا، میں کیسے ترے راز محفوظ کر کے رکھوں گا عجائب گھر میں"
دلدل پر پھدکتے مینڈک
اس کا مذاق اڑاتے ہیں
وہ مینڈکوں کی نسل کشی کی تحریک چلانے کا اعلان نہیں کرتا
(وہ بردبار نسل کا آخری جانشین ہے)

وہ چالیس دن بعد بھیس بدلتا ہے
اور بدلے ہوئے بھیس میں چھپا رہنے کا فن نہیں جانتا
اسے دیکھ کر کوئی بھی
پتھر کا ہاتھی کہہ سکتا ہے
جس کی سونڈ پر چیونٹی کے کاٹے کا اثر نہیں ہوتا
اور آواز

....

بغیر بجلی کے چلنے والے لاؤڈ اسپیکر جیسی ہے
جس پر ابلیس کے فرمودات سنائے جاتے ہیں
اس کے بھاری ڈیل ڈول پر فحش لطیفہ ایجاد ہو سکتا ہے
اور بڑے بالوں پر ایک گیت
جسے گانے کے لیے ہیجڑوں میں جنگ ہو سکتی ہے

وہ سبز باغ دکھانے والے راہب کا کردار نبھا سکتا ہے
چوراہے پر بندر کا تماشا
اور منہ سے آگ نکال کر دکھا سکتا ہے
پر سکون مسرتوں میں سرشار
اپنے فن کا خدا
جنت کی باتیں سنا کر جہنم کے ٹکٹ بیچ سکتا ہے

وہ کہانی کار سے زیادہ کراٹے ماسٹر لگتا ہے
مگر نئی نسل کا گرو ہے
جو منٹو پڑھے بغیر
فحش کہانی لکھنے کی ترغیب
اور اسد محمد خان کے حفظ شدہ کلیات سے درس دیتا ہے

وہ فلسفے کی موٹی موٹی کتابیں پڑھ کر
ہجرتی پرندوں کی طرح
دور دور کے انجان دیسوں کی طرف اڑ جاتا ہے
اور پوری ایک کائنات بناتا ہے
جو ''ڈھشما' کی اسرافیلی آواز سے نابود بھی ہو سکتی ہے
اور نئی کائنات کی دریافت کا باعث بھی!

وہ ادب کے کھیت میں بجو کا بن کر کھڑے نقادوں کے خلاف
مزاحمت کرتا ہے
اور لفظ لفظ چن کر

....

'معنی کی تلاش' میں رہتا ہے
اس کی روح دور تک پیچھا کرتی سفر میں روتی ہوئی
نہیں دیکھ سکتی
کہ
'سینٹرل چوک' میں
اس کا پتلا جلا کر احتجاج ہو رہا ہے

وہ بری کہانی سن کر داد دے سکتا ہے
اچھی کہانی کے چہرے پر سگریٹ داغ سکتا ہے
جانے کیوں نقاد بننے سے گریز کرتا ہے
(ہر روز نقاد بننے کے جراثیم ڈیٹول سے مار دیتا ہے)

وہ کسی لشکر کا سپہ سالار نہیں رہا
تلوار چھونے کا تجربہ نہیں رکھتا
مگر میرا ایقان ہے کسی روز
نئی نسل کے ساتھ
کہانی کا بگل بجا کر نواب کا شہر فتح کرلے گا

رائے علی اسجد

سفر زادے

یہاں کس نے تری آنکھوں کی الجھن پر
تھکن کی ٹکیہ رکھی ہے
یہاں کس نے ترے پاؤں سے ہجرت کے
سفر کی گفتگو کی ہے
یہاں کس نے ترے ہاتھوں کی پوروں سے
دعا کا پانی چھینا ہے!
سفر زادے!
ترے پاؤں کی ٹھوکر سے
کئی دریا نکلتے تھے
کئی موسم بدلتے تھے

سفر زادے!
اگر اُن شبنمی خوابوں کی سلجھن سے
نئے گیتوں کی ہریالی
غزل کہتی،
یہ ایم زندگی بہتی!
سفر زادے
ترے پیروں کی ٹھوکر سے
زمیں کے خالی سینے پر
دھواں اٹھتا
دھنک بنتی!

....

کہارے چاند کو سورج کی ڈولی میں
نئی کرنوں پہ رکھ دیتے
زمیں کو روشنی دیتے!

سفر زادے!
زمیں کی سوکھی ڈالی پر
نئے ساون کی برکھا کو
دعا کر دے
کہ پاؤں دھوپ مت روکے
کہ چھاؤں چلتی جائے اور سفر کی ریل گاڑی پر
نئے گیتوں کی ہریالی
ہمارے پاس رک جائے!

فرخ یار

سانسوں کا منڈل

ابد کے پرندے
کہاں رہ گئے تھے
تمھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری آنکھیں
سیاہی کے حلقوں میں گھلنے لگی ہیں
مری کھیتیوں جنگلوں کے مقابل
بڑی دیر تک خشک سالی کا موسم رہا ہے

یہ سانسوں کا منڈل
جو اک زاویے سے تو
ہم جیسوں کے واسطے زندگی تھا
ذرا غور سے دیکھنے پر کھلا کہ فریبِ نظر ہے
نمائش کا آبِ رواں ہے
مگر اس نمائش کی نقشہ گری میں کوئی بھی نہیں تھا
فقط ایک معدوم ہوتی ہوئی آرزو کی حرارت
فقط ایک گزرے ہوئے خواب کی جھلملاہٹ

ابد کے پرندے
مرا دن ذرا مختصر
شب طوالت بھری تھی
مشقت کی لمبی قطاروں میں لگ کے
بہت دیر تک جاگنا پڑ گیا تھا

....

سوچے کی سانسوں میں لرزاں جلن کے برابر
لٹکتے ہوئے آئینے ملگجے ہیں
مرے خال وخد میں کہیں نہ کہیں وقت بے وقت
ابلاغ کا مسئلہ تو رہے گا

ابد کے پرندے
کبھی تم کو دیکھا نہیں ہے
بہت غور سے دیکھنا ہے
تحیر کے پردے میں ہر بات سے
اک نئی بات کو کھینچنا ہے
تمھارے دھڑکتے ہوئے پاؤں پر پاؤں دھر کے کہیں دُور
سیرِ فلک کو نکلنا ہے میں نے
تمھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری آنکھیں
سیاہی کے حلقوں میں گھلنے لگی ہیں

م-ح مسرور

تم الگ ہو

تمھاری لوحِ دل کے قصے کو تسلیم کرتا ہوں
کہ شاعر نے تخیل کو خوب تراشا ہو گا
مگر کہاں تمھارے خیالوں کے راستے میں خود پر ہنسنا!

شاعر نے دیوان میں حسن کو مؤثر آواز دی ہو گی
میں نے تو دیکھا ہے تمھارے زلفوں کے بکھرنے سے پانی کا مچلنا!

بانہوں کی شرارت سے پگھلنے کے قصے جل گئے تھے
جب تم نے مجھے لڑکیوں کے گزرنے پر چادر میں چھپایا تھا!

نظر سے مرنے مارنے کے اشعار منجمد ہو جائیں
جب میں تمھاری نظر کے ردِ عمل میں قبر میں اتارا جاؤں

حق جتانے کی کوششیں کب ختم ہوتے ہوتے عروج پر محمول ہو جائیں؟
کیوں نہ کیمپس کی دیوار پر ایک تصویر لگا دی جائے!

دوسروں کی پارسائی کے افسانے کتنے ہی نرالے ہوں
ہماری ننگی باتوں سے معطر فضائیں افضل ہیں

جھمکوں پر بیٹھا میں للچائی نظروں سے تمھیں دیکھنے والا
جانے کب کہانی میں مر گیا ہوں

....

کنگن کی چھن چھن سے مرے کانوں میں شہنائی بج رہی ہے
یار!
تم بہت مشاق داشتہ ہو۔۔۔

حنائی ہاتھوں پر سجی تصویر اپلوڈ کرتے وقت یوں نہ لکھو
"آج باجی نے مہندی کیسے لگائی ہے"
مجھ سے خون ادھار لے کر یوں لکھو
"تمھارے مرنے کا انتظام ہو چکا ہے"
میں خمیدہ کمر خوابیدہ چراغ لیے جان دینے یوں آؤں گا
جیسے سورج افق کے مشرقی کنارے قدم رکھتا ہے!

مترجم: شاہد ماکلی

منتخب اشعارِ بیدل کا منظوم ترجمہ

خیالِ ما سوا فرش است، در وحدت سرای دل
درونِ خویش دارد، سینہء آیینہ، بیرون را

خیالِ ما سوا ہے فرش، وحدت خانۂ دل میں
رکھے ہے اپنے اندر، سینۂ آئینہ، باہر کو

تماشای دو رنگی بر نمی دارد حبابِ من
نظر تا بر تو وا کردم، ز چشمِ خویش حیرانم

نہیں سہتا تماشائے دو رنگی بلبلہ میرا
نظر جب تجھ پہ وا کی، چشمِ خود پر میں ہوا حیراں

شش جہت بیدل ھمین یک دل قیامت می کند
خانہء آیینہ ای، من ھم تماشا می کنم

شش جہت بیدل یہی اک دل قیامت کرتا ہے
خانۂ آئینہ ہے، میں بھی تماشا کرتا ہوں

بہارِ آرزو در دل، گلِ امید در دامن
بہ ہر رنگی کہ می آیم، چمن پرداز می آیم

بہارِ آرزو دل میں، گلِ امید دامن میں
میں جس بھی رنگ میں آؤں، چمن پرداز آتا ہوں

عرصہء آزادی از جوشِ غبارم تنگ بُود
بر سرِ خود دامنی افشاندم و صحرا شدم

عرصہ آزادی کا، جوشِ گرد سے میرے تھا تنگ
دامن اپنے سر پہ جھاڑا اور میں صحرا ہوا

بغیرِ عکس ندانم دگر چہ خواھی دید
اگر در آیینہ بینی جمالِ یکتا را

سوائے عکس کے، دیکھا ہے جانے کیا تو نے
جو تو نے آئنے میں دیکھا حسنِ یکتا کو

معنی ام اجزای بیرنگ است بیدل چون حباب
این قدر ھا شوخیِ اظہار دارد خامہ ام

معنٰی، بیرنگ اجزا ہیں بیدل مرے، مثلِ حباب
شوخیِ اظہار اتنی رکھتا ہے خامہ میرا

گردانده ام بہ ذوقِ خزان صد ھزار رنگ
بیدل ھنوز برگِ گلی زرد می کنم

ذوقِ خزاں میں لاتا ہوں گردش میں لاکھوں رنگ
بیدل، میں برگِ گل کو ابھی زرد کرتا ہوں

دیگر چہ سحر پرورَد افسونِ آرزو
من زان جہان بہ حسرتِ دیدارت آمدم

کیا اور سحر پھونکے گا افسونِ آرزو
اُس جگ سے تیری دید کی حسرت میں آیا ہوں

جز بادہ نیست چارہء دمسردیء زمان
سرما زدہ چرا نہ نشیند در آفتاب

دم سردیِ زماں کا نہیں چارہ جُز شراب
سرما زدہ نہ کس لیے بیٹھے گا دھوپ میں

آب در ہر سر زمیں دارد جدا خاصیّتی
نشہ باشد مختلف در ہر طبیعت بادہ را

ہر زمیں میں ہوتی ہے پانی کی خاصیّت جدا
ہر طبیعت میں نشہ ہوتا ہے مَے کا مختلف

اوجِ دولت سفلہ طبعان را دو روزی بیش نیست
خاک اگر امروز بر چرخ است، فردا زیرِ پاست

ہیچ فطرت کو نہیں دو دن سے بڑھ کر اوجِ مال
خاک اگر ہے آج گردوں پر تو کل ہے زیرِ پا

دنیا اگر دہند ، نہ جنبم ز جای خویش
من بستہ ام حنای قناعت ز پای خویش

دنیا اگر وہ دیں، نہ ہِلوں اپنی جا سے میں
باندھی ہے میں نے مہندی قناعت کی، پاؤں پر

بیدل آن شعلہ کزو بزمِ چراغان گرم است
یک حقیقت بہ ہزار آیینہ تابان شدہ است

گرم جس شعلے سے ہے بزمِ چراغاں بیدلؔ
اک حقیقت ہے جو روشن ہے ہزار آئنے میں

چہ آغوش است یارب ! موجہء دریای رحمت را
کہ ھر کس رہ ندارد ھیچ سو ، سوی تو می آید

ہے کیا آغوش یا رب! موجۂ دریائے رحمت کا
کہیں پاتا نہیں جو راہ، تیری سمت آتا ہے

نیست پوشیدہ ز اربابِ نظر
کہ تردّد ز توکل بہتر

نہیں اربابِ نظر سے مخفی
کہ توکل سے تردّد بہتر

رنگ ھای این چمن یکسر شکست آمادہ اند
اے اسیرِ رنگ، بے رنگی بنای محکم است

اس چمن کے رنگ سب یکسر شکست آمادہ ہیں
اے اسیرِ رنگ! بے رنگی ہے اک محکم اساس

چیست شغلِ جہانِ حیرانی
خاک خوردن بہ قدرِ استعداد

شغل کیا ہے جہانِ حیرت کا
پھانکنا خاک ، حسبِ استعداد

چون سپندم در آتشی کہ مپرس
سرمہ گردم اگر کنم فریاد

مثلِ اسپند آگ میں ہوں ، نہ پوچھ
سرمہ ہو جاؤں، گر کروں فریاد

بیدل نویدِ قاصدِ بد لہجہ ماتم است
مکتوبِ نو بہار نبندی بہ بالِ زاغ

بیدل نویدِ قاصدِ بد لہجہ ماتم است
مکتوبِ نو بہار نبندی بہ بالِ زاغ

تا زندگی ست ، عمرِ اقامت نصیب نیست
وحشت شکستہ دامنِ صبحِ دمیدہ رو

جب تک ہے زیست، عمرِ اقامت نہیں نصیب
وحشت سے چاک، دامنِ صبحِ دمیدہ کو

وضعِ آغوشِ وصل ممکن نیست
از دو عالم کنار خواهم کرد

وضعِ آغوشِ وصل ممکن نئیں
دو جہاں سے کنارہ کر لوں گا

بیدل اقبالِ ضعیفی ھای ما پوشیدہ نیست
آفتابِ عالمِ عجز است رنگ زرد ما

بخت اے بیدل ہمارے ضعف کا پنہاں نہیں
عجز کی دنیا کا سورج ہے ہمارا رنگ زرد

عمریست درسم از لبِ لعلِ خموشِ تست
یعنی شنیدہ ام سخنِ ناشنیدہ را

کب سے ہے درس تجھ لبِ لعلِ خموش سے
یعنی میں سنتا ہوں سخنِ ناشنیدہ کو

سیرِ باغِ خود نمائی ھا اگر منظور نیست
سبزۂ بام و درِ آیینہ می دان زنگ را

سیر، باغِ خود نمائی کی، نہیں منظور اگر
سبزۂ بام و درِ آئینہ سمجھو، زنگ کو

بہار می طلبی، سیرِ رنگ کن بیدل
ز جلوہ آنچہ طمع داری از نقاب طلب

بہار چاہیے تو سیرِ رنگ کر بیدل
تو جلوے سے جو طمع رکھتا ہے، نقاب سے مانگ

از چراغِ دیدۂ خفّاش می گیرم بلد
تا سراغِ خانۂ خورشید پیدا می کنم

میں چراغِ دیدۂ خفّاش سے پاتا ہوں راہ
تب سراغِ خانۂ خورشید پیدا کرتا ہوں

ہر چہ می بینم، تپش آمادۂ صد جستجو ست
زین بیابان نقشِ پا ھم نیست بے آوازِ پا

جو بھی دیکھوں ، ہے تپش آمادۂ صد جستجو
نقشِ پا بھی اس بیاباں میں نہیں بے صوتِ پا

راہِ عدم بہ سعیِ نفس قطع می کنیم
افکندہ ایم بارِ خود از دوشِ نقشِ پا

سعیِ نفَس سے راہِ عدم کاٹتے ہیں ہم
ہم، دوشِ نقشِ پا سے گراتے ہیں اپنا بار

مقصدِ عشق بلند است ، ز افلاک مپرس
نشہ مشکل کہ شوَد از خطِ ساغر پیدا

مقصدِ عشق تو اونچا ہے،فلک سے مت پوچھ
نشہ مشکل ہے کہ پیدا ہو خطِ ساغر سے

نقشِ ھر کس مکرر است اینجا
آگہی چشمِ احولی دارد

نقش سب کا یہاں مکرّر ہے
آگہی بھینگی آنکھ رکھتی ہے

دلِ آگاہ نایاب است بیدل کاندرین دوران
نشستہ پنبۂ غفلت بہ جای مغز در سر ھا

دلِ آگاہ ہے نایاب بیدلؔ، اِس زمانے میں
سروں میں پنبۂ غفلت، بجائے مغز، رکھا ہے

مباش غافلِ ارشادِ گمرہی بیدل
جہانِ غول بہ ہر دشت آدمی دارد

نہ رہیو غافلِ ارشادِ گمرہی بیدل
جہانِ غول کا ہر دشت میں اک آدمی ہے

فنا هم مایۂ هستی ست، از آفت مباش ایمن
که چون بگذشتی از مردن، قیامت سر برون آرد

فنا بھی مایۂ ہستی ہے، آفت سے نڈر مت رہ
کہ جب گزرا تو مرنے سے، قیامت سر اُٹھاتی ہے

مژه ای باز نه کردم هیهات
پر زدن زیر پرم می گذرد

میں نے پلکیں نہیں کھولیں افسوس
زیرِ پر گزرے ہے پرواز مری

شرر به صفحه زن و فرصتِ طرب دریاب
شبِ سحر نفست بے چراغ می گزرد

شرر ورق پہ گرا ، فرصتِ طرب پا لے
سحر نفس، تری شب ، بے چراغ گزرے ہے

مرده ام امّا همان رقصِ غبارم تازه است
خاکِ راهِ کیستم یا رب که می نازم هنوز

مردہ ہوں، پر ویسا ہی تازہ ہے میرا رقصِ گرد
کس کی خاکِ راہ ہوں یارب کہ نازاں ہوں ابھی

قدم به وادیِ فرصت زن و مژه بردار
بهار می رود اے بیخبر شتاب طلب

قدم فراغ کی وادی میں رکھ، اٹھا مژگاں
بہار جاتی ہے اے بیخبر شتابی مانگ

در بغل نامۂ عنقا دارم
خبرم بے خبرم می گذرد

نامہ عنقا کا بغل میں ہے مرے
بیخبر میری خبر گزرے ہے

زمین تلک فلک نغمۂ بیدل است
بر این ساز بشکن بم و زیر را

زمیں تا فلک نغمہ بیدل کا ہے
اسی ساز پر گا بم و زیر کو

بیدل نه به دنیا ست قرارت نه به عقبا
خورده است خدنگ تو ازین هفت کمان کند

بیدل نہ ہے دنیا میں نہ عقبا میں تجھے چین
ناوک ہے ترا کند اسی ہفت کماں سے

دردِ سرِ زبان مده از حرفِ نارسا
از خم برون میار مےِ نارسیده را

دیں حرفِ نارسا سے زباں کا نہ دردِ سر
باہر نہ لائیں خم سے مئے نارسیدہ کو

غنیمت گیر چون آیینه محوِ شانِ خود بودن
جهانی را تماشا کردن و حیرانِ خود بودن

غنیمت جان، جوں آئینہ، محوِ شانِ خود ہونا
زمانے کا تماشا کرنا اور حیرانِ خود ہونا

بیدل برونِ خویش به جایی نه رفته ایم
ما را ز پرده بهرِ چه آواز می دهند

بیدل ہم اپنے آپ سے جاتے نہیں کہیں
پردے سے ہم کو کس لیے آواز دیتے ہیں

نازِ غرور شیفته ای وضع عاجزی ست
رنگِ شکسته را پرِ پرواز می دهند

نازِ غرور، شیفتہ وضعِ عجز ہے
رنگِ شکستہ کو پر پرواز دیتے ہیں

شامِ ابد بہ جیبِ تو سر می برد فرو
صبحِ ازل ز تو سخن آغاز می کند

شامِ ابد ہے تیرے گریباں میں سرنگوں
آغاز تجھ سے کرتی ہے صبحِ ازل، سخن

ہر طرف سایہ صفت می گزرم
یک شبِ بے سحرم می گزرد

ہر طرف سایہ صفت گزروں ہوں
رات بے صبح گزرتی ہے مری

این دشت، یک قلم، ز غبارِ نفَس پُر است
حیرت کشیدہ است بہ ہر سو طنابِ صبح

یہ دشت سر بسر ہے غبارِ نفَس سے پُر
حیرت کشیدہ چاروں طرف ہے طنابِ صبح

از چاکِ دل رھی بہ خیالِ تو بُردہ ایم
جز آفتاب چہرہ نہ دارد نقابِ صبح

رہ، چاکِ دل سے پاتے ہیں تیرے خیال تک
جز آفتاب رُخ نہیں رکھتی نقابِ صبح

بیداری ام بہ خوابِ دِگر ناز می کند
پاشیدہ اند بر رخِ شمعم گلابِ صبح

بیداری میری خوابِ دگر پر کرے ہے ناز
چھڑکا گیا ہے شمع کے رخ پر گلابِ صبح

غبارِ دھر غنیمت شمر کہ آینہ ھم
ز خویش می گذرد، گر ز زنگ می گذرد

غبارِ دہر غنیمت سمجھ کہ آئنہ بھی
گزرتا خود سے ہے، گر زنگ سے گزرتا ہے

معنی نمای چہرۂ مقصود، نیستی ست
بیدل مرا گداختن آیینہ ساز کرد

معنی نما ہے چہرہء مقصود کا، عدم
آئینہ ساز کر دیا مجھ کو گداز نے

دو روزہ فرصتِ وہمی کہ زندگی نام است
گر از ہوس گذری ، بے ملال می گذرد

دو روزہ وہم کی مہلت کہ جس کا نام ہے زیست
ہوس سے گزرو اگر، بے ملال گزرے ہے

می لرزد از نفس دمِ تقریرِ احتیاج
دستِ تہی زبان مرا مرگِ بید کرد

لرزے ہے سانس سے دمِ تقریرِ احتیاج
دستِ تہی زباں نے کیا مجھ کو مرگِ بید

حقِ ادائے رموز از قلم طلب بیدل
کہ حرفِ دل بہ زبان ھای لال می گذرد

قلم سے چاہیے بیدل حقِ ادائے رموز
کہ حرف، لال زباں پر ہی دل کا آتا ہے

گر از صہبا نیاید چارہء مخموری ام بیدل
قدح از خویش خالی می کنم، سرشار می گردم

نہ ہو صہبا سے گر چارہ مری مخموری کا بیدل
قدح خود سے میں خالی کرتا ہوں، سرشار ہوتا ہوں

ز خود رفتن بہاری داشت در باغِ ہوس بیدل
بقدرِ رنگِ گل، من ھم، درین گلزار گردیدم

بہار اک، بیخودی کی ہے ہوس کے باغ میں بیدل
بقدرِ رنگِ گل، میں بھی ہوں گرداں اس گلستاں میں

سجودِ سایہ از آفات دارد ایمنی بیدل
تو ھم گر عافیت خواھی، نہان کن در جبین خود را

سجودِ سایہ رکھتا ہے نڈر ، آفات سے ، بیدل
جو تو بھی عافیت چاہے، جبیں میں کر نہاں خود کو

امان خواہ از گزندِ خلق در گرم اختلاطی ھا
کہ عقرب بیشتر در فصلِ تابستان شود پیدا

پنہ مانگو گزندِ خلق سے گرم اختلاطی میں
کہ بچھو بیشتر گرمی کی رُت میں ہوتا ہے پیدا

از ہجومِ عاجزان غافل نہ باید زیستن
مورِ مسکین ہر کجا جوشید باھم، اژدر است

عاجزوں کی بھیڑ سے غافل نہ جینا چاہیے
چونٹیاں ہیں اژدہا، مل کر جہاں حملہ کریں

بہ مضمونِ کتابِ عافیت تا وارسی بیدل
برنگِ سایہ روشن کن سوادِ ناتوانی را

تو مضمونِ کتابِ عافیت کو پہنچے جب بیدل
برنگِ سایہ روشن کر سوادِ ناتوانی کو

دلِ گداختہ بیدل نیازِ مژگان کن
طراوتِ چمنِ عمر ازین سحاب طلب

دلِ گداختہ بیدل نیازِ مژگاں کر
طراوتِ چمنِ عمر اِسی سحاب سے مانگ

ما ھمہ اشک و تو مژگان، ما ھمہ تخم و تو ابر
دست گیری از تو می زیبد، ز ما افتادگی

ہم ہیں آنسو تُو پلک ، ہم بیج ہیں تو ابر ہے
دستگیری تجھ کو زیبا ہے، ہمیں افتادگی

بے چراغ از ما کہ می یابد سراغ
خانۂ گم کردۂ پروانہ ایم

کھوج اپنا کون پائے بے چراغ
خانۂ گم کردۂ پروانہ ہیں

ز بیدل مپرسید مضمونِ زلفش
چہ خواند کسی خطِ پیچیدۂ شب

نہ مضمونِ زلف اس کا، بیدل سے پوچھو
کوئی کیا پڑھے خطّ پیچیدۂ شب

در زیرِ چرخ یک مژہ راحت طمع مدار
آفت شناس سایۂ سقفِ خمیدہ را

زیرِ فلک نہ یک مژہ راحت کا رکھ طمع
آفت ہی جان سایۂ سقفِ خمیدہ کو

ریزشِ اشکِ ندامت ز سیہ کاری ھا ست
لازم است ابرِ سیہ قطرۂ نیسانی را

ریزشِ اشکِ ندامت ہے سیہ کاری سے
ہے ضرور ابرِ سیہ قطرۂ نیسانی کو

جاہل از جمعِ کتب صاحبِ معنی نہ شود
نسبتی نیست بہ شیرازہ سخن دانی را

اہلِ معنٰی نہ ہوا جمعِ کتب سے جاہل
نہیں شیرازے سے کچھ ربط سخن دانی کو

فکرِ تعلقِ جسدم نیست چون نفَس
عمریست خدمتِ دلِ آزادہ می کنم

جوں سانس، نئیں بدن سے تعلق کی مجھ کو فکر
مدت سے خدمتِ دلِ آزادہ کرتا ہوں

فکر ہر جا رموزِ تخم شگافت
جز ہیولائی برگ و بار نہ یافت

فکر نے کھولی رمزِ تخم جہاں
جز ہیولا نہ پایا برگ و بار

تشویشِ بال و پر مکش اے طالبِ فنا
این راہ قطع می شود از پای لنگ ھم

تشویشِ بال و پر نہ کر اے طالبِ فنا
یہ راہ پائے لنگ سے بھی قطع ہوتی ہے

بیدل از وہم جنون سامان مپرس
گنج ناپیدا و ما ویرانہ ایم

پوچھ مت وہمِ جنوں سامان کا
گنج نا پیدا ہے ، ہم ویرانہ ہیں

غرورِ عشرتِ ما با شکست نزدیک است
دمی کہ قطرہ ببالد، حباب می گردد

غرورِ عیش ہمارا ہے ٹوٹنے کے قریب
کہ جس دم اُبھرے تو قطرہ حباب ہوتا ہے

ھمین کشاکشِ اوھام تا ابد باقیست
فنا کجاست، تو خواھی بزی و خواہ بمیر

وہی گماں کی کشاکش ہے تا ابد باقی
فنا کہاں ہے، تُو چاہے جیے کہ چاہے مرے

افسردگیت نیست جز اوھامِ تعلق
ہر چند شرر نیست، تو از سنگ برون آ

مایوسی نہیں تیری، جُز اوہامِ تعلق
تُو گو کہ شرارہ نہیں، پتھر سے نکل آ

یوسفی کن، اگر اسبابِ مسیحائی نیست
بہ فلک گر نرسیدی، بُنِ چاھی دریاب

یوسفی کر ، اگر اسبابِ مسیحائی نہیں
چرخ تک گر نہیں پہنچا تو کنویں کو پا لے

آنچہ بیداریِ ما دامِ نظر می فہمید
حیرتی بُود کہ در خواب تماشا کردیم

اپنی بیداری نے سمجھا تھا جسے دامِ نظر
ایک حیرت تھی جسے خواب میں دیکھا ہم نے

دامنِ تسلیم ہم آسان نمی آید بہ دست
خاک گردیدیم ، تا شد آشنا افتادگی

دامنِ تسلیم بھی آسان ہاتھ آتا نہیں
ہم ہوئے مٹی ، ہوئی تب آشنا افتادگی

شیوۂ عشاق چون اشک است در راہِ نیاز
ابتدا سرگشتگی ھا ، انتہا افتادگی

شیوۂ عشاق ہے جوں اشک راہِ عجز میں
ابتدا سرگشتگی ہے ، انتہا افتادگی

چیزی از خود ہر قدم زیرِ قدم گم می کنم
رفتہ رفتہ، ہر چہ دارم، چون قلم گم می کنم

چیز از خود ہر قدم زیرِ قدم گم کرتا ہوں
رفتہ رفتہ، پاس جو ہے، جوں قلم گم کرتا ہوں

تا غبارِ وادیِ مجنون بہ یادم می رسد
آسمان برسر، زمین زیرِ قدم گم می کنم

جب غبارِ وادیِ مجنوں مجھے آتا ہے یاد
آسماں بر سر، زمیں زیرِ قدم گم کرتا ہوں

این است اگر سواد و بیاضِ کتابِ دہر
بے خاتم است تا بہ ابد داستانِ لاف

گر ہے یہی سیاہ و سفیدِ کتابِ دہر
بے خاتمہ ہے تا بہ ابد داستانِ لاف

متاعِ خانۂ آئینہ حیرت است اینجا
تو دیگر از دلِ بے مدعا چہ می جوئی

متاعِ خانۂ آئینہ ہے یہاں حیرت
تُو اور کیا دلِ بے مدعا سے چاہتا ہے

مخور بیدل فریبِ تازگی از محفلِ امکان
کہ من عمریست می بینم ھمان چرخ و ھمان انجم

نہ کھا بیدل فریبِ تازگی امکاں کی محفل سے
کہ کب سے دیکھتا ہوں میں وہی چرخ اور وہی انجم

ز خود تہی شدم ، از عالمِ خراب گذشتم
چہ سِحر بُود کہ بر کشتی از سراب گذشتم

میں خود سے خالی ہوا، عالمِ خراب سے گزرا
طلسم کیا تھا کہ میں کشتی پر سراب سے گزرا

شرار بُود کہ در سنگ بُود آئنۂ من
بہ خویش دیر رسیدم کہ از شتاب گذشتم

شرار تھا کہ جو پتھر میں آئنہ ہوا میرا
میں پہنچا دیر سے خود تک کہ میں شتاب سے گزرا

چہ ممکن است بہ این جراتم ز خویش گذشتن
اگر ز سایہ گزشتم، ز آفتاب گذشتم

گزرنا خود سے ہے کیا ممکن اِس دلیری سے میرا
اگر میں سائے سے گزرا ہوں، آفتاب سے گزرا

در یادِ عمرِ رفتہ ، دِلی شاد می کنم
رنگِ پریدہ ای بہ خیال ، آشیانہ ایست

دل یادِ عمرِ رفتہ میں ، میں شاد کرتا ہوں
اک آشیاں ہے ، رنگِ پریدہ خیال میں

مقامِ وصل نایاب است و راہِ سعی ناپیدا
چہ می کردیم یارب گر نبودے نارسایی ھا

مقامِ وصل ہے نایاب ، راہِ سعی ناپیدا
میں کیا کرتا، اگر یا رب نہ ہوتی نارسائی بھی

بہ سازِ ہستیِ نیرنگِ محفل سخت حیرانم
کہ نبضِ نالہ خاموش است و دل مستِ شنیدن ھا

ہوں سازِ ہستیِ نیرنگِ محفل پر بہت حیراں
کہ نبضِ نالہ ہے خاموش، دل ہے مست سننے میں

کسے یا رب مباد افسردۂ نیرنگِ خود داری
شرارم سنگ شد ، از کُلفتِ صبر آزمائی ھا

کوئی یا رب نہ ہو افسردۂ نیرنگِ خود داری
شرر میرا ہوا پتھر ، غمِ صبر آزمائی سے

حذر کن از تماشا گاہِ نیرنگِ جہان بیدل
تو طبعِ نازکی داری و این گلشن ہوا داری

تماشا گاہِ نیرنگِ جہاں سے کر حذر بیدلؔ
یہ گلشن ہے ہوا دار ، اور تو نازک طبیعت ہے

دلِ آسودۂ ما شورِ امکان در قفس دارد
گہر دزدیدہ است این جا عنانِ موجِ دریا را

ہے بند اپنے دلِ آسودہ میں دنیا کا ہنگامہ
گہر کے ہاتھ میں ہے باگ اِس جا موجِ دریا کی

سراغِ قافلۂ عمر سخت ناپیدا ست
ز رہ گزارِ نفس نقشِ پا چہ می جویی

سراغِ قافلۂ عمر ہے بہت ناپید
نفَس کی راہ سے کیا نقشِ پا تلاشتا ہے

بر امیدی آنکہ یابیم از دھانِ او نشان
روئے خود را جانبِ ملکِ عدم داریم ما

اِس توقع پر کہ پا لیں اُس دہن کا ہم نشاں
اپنا چہرہ جانبِ ملکِ عدم رکھتے ہیں ہم

از جراحت زارِ دل غافل مباش
رنگھا دارد دکان گلفروش

دل کے نشتر زار سے غافل نہ رہ
رنگ رکھتی ہے دکانِ گل فروش

زندگی بیدل دلیلِ منزلِ آرام نیست
چون نفس در زیرِ پا دل دارم و دل آتش است

زندگی بیدل دلیلِ منزلِ راحت نہیں
جوں نفس، پاؤں تلے دل رکھتا ہوں، دل آگ ہے

در جستجوے ما نہ کشی زحمتِ سراغ
جاے رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد

ہم کو نہ ڈھونڈنے میں اٹھا زحمتِ سراغ
پہنچے ہیں ہم وہاں، جہاں عنقا پہنچ نہ پائے

شاخ از گلبُن جدا ، مصروفِ گلخن می شود
زندگی بادوستان عیش است و تنہا آتش است

شاخ کٹ کر پیڑ سے ہو جاتی ہے چولھے کی نذر
دوستوں کے ساتھ ہستی عیش ، تنہا آگ ہے

بیدل از کلفتِ شکست منال
بزمِ ہستی دکانِ شیشہ گر است

تُو نہ بیدل غمِ شکست پہ رو
بزمِ ہستی ہے شیشہ گر کی دُکاں

ز پروازِ غبارِ رنگ و بو آواز می آید
کہ بال افشانیِ عنقا درین گلشن نمی گنجد

غبارِ رنگ و بو کے اڑنے سے آواز آتی ہے
کہ اس گلشن میں گنجائش نہیں پروازِ عنقا کی

شہزاد نیر

لاہور
23 اکتوبر 2021
السلام علیکم!

میں نے سخن دان کا شمارہ 06 پڑھا۔ یقین کیجیے دل باغ باغ ہو گیا۔ 76 صفحات میں سب کچھ چنیدہ۔ اداریے سے تبصرے تک، عمدہ مضامین و تخلیقات پڑھنے کو ملے۔ یہ معیار بندی اس سبب سے بھی ہے کہ سرپرست سے لے کر مجلس ادارت تک، ہر کوئی اپنی جگہ پہ آفتاب ہے۔ اسی لیے روشنی بانٹتے شمارے کی ہر کرن نظر نواز ہے۔

مدیر نے اداریے میں ادب کے منہاج پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ رحیم گل کے ناولوں پر ظہور گل کا مضمون، شاہین کاظمی کا افسانہ، کاشف حسین غائر کی غزل، توحید زیب کی نظم اور وصاف باسط کا ترجمہ خصوصی کے ساتھ پسند آئے۔

میں دیانت داری سے کہتا ہوں کہ ایسا ہی کڑا معیار رہا تو سخن دان اپنی ایک روایت بنا لے گا۔ نیک خواہشات

شہزاد نیر

تنویر قاضی

یاسر اقبال!

امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

لگا سخن دان ایک آدرشی میگزین ہے کہ اطراف میں سارا ادب برائے ادب لکھا جا رہا ہے۔ بنا جہت و مقصد جو شاعری اور فکشن لکھے گئے وہ ڈھول ہو گئے۔ دیکھیں لورکا، پابلو نیرودا، محمود درویش، ناظم حکمت، گورکی، گارسیا، سرمد، رومی، مادھو لال حسین، فیض، جالب،.... کیوں زندہ ہیں کہ وہ نظریاتی ہیں۔ اداریہ میں کچھ کو چھوڑ کر گول مول کا ذکر کیا گیا۔ میرے نزدیک تو وہ عمرہ و حج بھی خود غرضی میں آئے گا جب تک آخری آدمی کے سر پر شیلٹر، پاؤں میں جوتا، تن پر پوشاک اور پیٹ میں روٹی نہیں۔ کبھی یہ اداریہ لکھنے سے پہلے منشی پریم چند صاحب کا انجمنِ ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس کا صدارتی خطبہ اور افسانوں کی کتاب ''ہوا'' کے مصنف کا پیش لفظ پڑھ لیتے تو آپ کے شخصی ریفرینسز اور ہو جاتے۔

پھر بھی سخن دان ایک اچھی کاوش تو گنی جائے گی کہ لفظ ترسیلی سفر میں ایک دن آدرشی ہو جایا کرتے ہیں اور ایسا ہونا ہے، تاریخی پہیہ تو آگے ہی جانا ہے۔ زمینی ملکیت کے خاتمے تک ایکراس دی فرلڈ عافیت نہیں آسکتی اسی میں سارا سوسائٹی تشنج دھرا ہے۔ اس کا پرچار ادبی پلیٹ فارمز پر بہت ضروری ہے۔ فکشن آپ کا کمزور ہے شاعری قدرے بہتر ہے۔ کاشف حسین غائر کی غزل اور سلیم شہزاد کی نظم نے توجہ کھینچی۔ سخن دان اور اس کے منتظمین کے لئے بہت دعا!

تنویر قاضی

صاحب زادہ احمد ندیم

21 اکتوبر 2021ء

مدیر محترم! السلام علیکم

سخن دان کا شمارہ 06 نظر نواز ہوا۔ ایک مختلف ذائقے کا ادب پڑھنے کو ملا۔ مختصر کہانیاں، غزلیں اور نظمیں تیکھے ذائقے اور نئے زاویوں کی حامل نظر آئیں۔ تنقیدی مضمون میں بیانیہ کی ساخت کو بیان کرنے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے۔

سخن دان کا اداریہ بطورِ خاص پسند آیا۔ ادب اور قاری کے ٹوٹے ہوئے رشتے سے مکمل آگاہی کے ساتھ ساتھ ادب کی اہمیت پر اصرار مدیر محترم کے جذبے کی صداقت کی گواہی ہے۔

معاصر دنیا میں ادب سے بے اعتنائی نے جو فکری و نظری اور جمالیاتی بحران پیدا کیے ہیں ان کا اندازہ معاصر انسانی رویوں کے غالب رجحان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے پاکستانی معاشرہ بطورِ خاص جس فکری و نظری اور جذباتی ناہمواری کا شکار ہے اس کا ایک سبب ادیب اور معاشرے کا رشتہ کمزور ہو جانا ہے ایک طرف ادیب شاعر ہو یا کہانی نویس اپنی الگ دنیا میں گم ہے اور اپنے اظہار کو ابلاغ سے ہم کنار کرنے کا آرزو مند ہی نظر نہیں آتا، دوسری طرف قاری ناپید ہے۔ ادب کا قاری ان دنوں ادیب خود ہی ہے۔ میری نظر میں اس کا سبب معاشرے کی اجتماعی بے سمتی ہے جس کی جڑیں بے مقصدیت، بے یقینی، اور اخلاقی شعور کے بحران میں پیوست ہیں اور یوں معاشرت، معیشت، اور سیاست بھی نذرِ انتشار ہو چکے ہیں۔ ایسے میں ادیبوں کا اجتماعی بحران کے شعور کے ساتھ ادب تخلیق کرنا اور اسے قاری تک پہچانے کی کوشش کرنا نہایت خوش گوار اور امید افزا ہے۔

سخن دان کی شاعری میں بھی ایک الگ ذائقہ دکھائی دیتا ہے۔ غزل اور نظم میں نئے استعاروں اور لفظیات سے تازگی کا احساس ہوا ہے۔

میں سخن دان کے سرپرست ڈاکٹر افتخار الحق، مدیر جناب غلام مصطفی دائم اور ارکانِ مجلسِ ادارت ڈاکٹر خالد علوی، جناب یاسر اقبال، اور نیلم ملک صاحبہ کو ایسا عمدہ شمارہ نکالنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ سخن دان ادیب اور معاشرہ کے ٹوٹے ہوئے تعلق کی بحالی اور بازیافت میں اہم کردار ادا کرے اور معاشرے کی فکری و نظری اور جمالیاتی ضرورتوں کی کفالت کرے۔

ڈاکٹر صاحب زادہ احمد ندیم

شہزاد احمد شاذؔ

جلال پور جٹاں گجرات
24 اکتوبر 2021ء

محترم جناب غلام مصطفی دائم اعوان صاحب (مدیر ماہنامہ سخن دان)
السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

امید ہے بخیر وعافیت ہوں گے۔ سخن دان کا چھٹا شمارہ پی ڈی ایف کی صورت میں موصول ہوا۔ میرے لیے یہ پہلا شمارہ ہے جسے بغور دیکھنے کا موقع ملا۔ پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک ایک معیار نظر آیا۔ گروہ بندی اور اقربا پروری کے اس دور میں صرف اور صرف معیار کو ترجیح دینے کی یہ روش قابل تقلید ہے۔ اس پر سخندان کی پوری ٹیم داد اور مبارک باد کی مستحق ہے۔

ویسے معیاری کتاب یا رسالے کا ایک مسئلہ ہوتا ہے وہ یہ کہ بندہ سوچ میں پڑ جاتا ہے اس پر بات کرتے ہوئے اس کے کس گوشے کو لیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے۔

اداریے کی تعریف میں اتنا کہنا کافی ہے کہ دائم اعوان صاحب کے قلم سے سرزد ہوا ہے تحقیق پر مبنی دلائل سے مزین ایک فکر انگیز تحریر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ معاشرے اور ادب کا تعلق روز بروز زوال پذیر ہے۔ اس حقیقت سے نظریں چرا کر ہمارے پیش رو آج ہاتھ مل رہے ہیں تو اس سے اغماض برت کر تاسف وملال کے سوا ہمارے ہاتھ بھی کچھ نہیں آئے گا۔ اگر کم از کم شعر وادب سے وابستہ احباب ہی خلوص نیت سے غور وفکر کر کے کچھ سنجیدہ اقدامات اٹھا لیں تو ممکن ہے معاشرے اور ادب کے تعلق کی زمین بوس ہوتی عمارت کو کچھ سہارا دیا جا سکے۔ یہ موضوع بار بار گفتگو کا متقاضی ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ اس موضوع کو اپنے اپنے حلقوں میں ضرور زیر بحث لائیں۔

رسالے میں صفحات کی تقسیم بہت عمدہ ہے دو مضامین، تین افسانے، پانچ غزلیں، پانچ نظمیں، ایک پشتو نظم کا اردو ترجمہ اور ایک کتاب پر تبصرہ۔

حصہ غزل کے لیے چنیدہ تمام غزلیں عمدہ ہیں شعرا کے لیے داد وتحسین پیش کرتا ہوں۔ اپنے ذوق کے مطابق چند اشعار کا انتخاب شامل کر رہا ہوں ملاحظہ فرمائیں:

عمر بھر ڈھونڈتے رہیے گا سبب ہونے کا　　ایسی رسی کا فقط ایک سرا ہوتا ہے
سرفراز آرش

میری پیشانی پہ دائیں ہاتھ کی انگشت سے　　ایک خوش قامت نے اپنا نام ہے لکھا ہوا
سیماب ظفر

ہوا کی باتوں میں آیا ہوا پرندہ ہے　　غبار ہے کہ سدھایا ہوا پرندہ ہے
عجب نہیں کہ کسی روز یہ بھی اڑ جائے　　جو کینوس پہ بنایا ہوا پرندہ ہے
کاشف حسین غائر

چھٹے شمارے کے آخری صفحات پر بندہ ناچیز کی کتاب ''شعر کیسے بنتا ہے'' پر آں جناب کا تبصرہ چھپا ہے جو میرے لئے اس شمارے کو اور بھی خاص بنا دیتا ہے۔ تبصرہ اس بات کی گواہی ہے کہ آپ نے کتاب کا ہر صفحہ نہایت توجہ سے ملاحظہ فرمایا ہے اور پوری دیانت داری سے اپنی رائے کا اظہار فرمایا۔ صرف روایت کی پیروی کے نام پر علم عروض کو غیر ضروری طور پر نہایت پیچیدہ کر کے پیش کیا جاتا رہا ہے جب کہ وقت کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ ہر علم کی طرح علم عروض کو بھی آسان سے آسان پیرائے میں پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ کتاب لکھتے ہوئے میرا مطمع نظر بھی یہی تسہیل تھی۔ آپ جیسے وسیع مطالعہ رکھنے والے شخص کا اپنے تبصرے میں فرمانا کہ ''میں نے اتنے سہل اور مفید عروضی لیکچرز اب تک نہ دیکھے نہ پڑھے'' گویا اس بات پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہوں۔ الحمدللہ!

آپ نے الفاظ کی قسموں کے لیے اصطلاحی ناموں کے استعمال کی ضرورت پر زور دیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں سبب خفیف، سبب ثقیل، سبب موقوف، سبب متوسط، سبب طویل، وتد کثرت، وتد مجموع و مقرون، وتد مفروق، وتد موقوف، فاصلہ صغریٰ، فاصلہ کبریٰ وغیرہ جیسی اصطلاحات اور ان کی تعریفات اگر کتاب میں شامل کر لی جاتیں تو یہ ایک روایتی عروضی کتاب بن کر رہ جاتی اور آپ اسے عروض پر لکھی جانے والی سب سے آسان کتاب نہ کہتے۔ جب کہ آج ہزاروں لوگ ان اصطلاحات سے بے بہرہ ہونے کے باوجود کامیابی سے وزن میں شعر کہہ رہے ہیں اور میری رائے میں وزن میں شعر کہنے کے قابل بنانا ہی ایسی کتاب کا مقصود اصلی ہونا چاہیے۔ البتہ عروضی مباحث میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اصطلاحات سے آشنائی ضروری ہے۔ کتاب پریس میں جا چکی تھی کہ ایک شاگرد کو بحرِ میر کے ضمن میں درج غیر ضروری تفصیلات میں الجھا ہوا پایا تو خیال آیا کہ اگر یہ تفصیلات (جن کا شعر کہنے کی صلاحیت بڑھانے میں کوئی کردار نہیں ہے) کتاب میں موجود رہیں گی تو ممکن ہے پڑھنے والا کوئی نیا دوست ان زاید تفصیلات میں الجھ کر اس موضوع کی اصل گفتگو کو نظر انداز کر بیٹھے۔ سو پریس والے کو فون کر کے پرنٹ نکالنے سے روکا اور ضروری ترامیم کے بعد کتاب دوبارہ بھیجی۔

درج بالا سطور سے خدانخواستہ تبصرے کا جواب لکھنا مقصود نہیں ہے بلکہ آپ کا اس باریک بینی سے کتاب ملاحظہ فرمانا اور تبصرے کے لیے منتخب کرنا میرے لیے قابلِ صد افتخار ہے۔ خاص طور پر مختلف مقامات پر اشعار سے مثالیں پیش کرنے کی تجویز پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں اگلی اشاعت میں ترامیم لانے کا اہتمام کروں گا۔ ان شاءاللہ!

آخر میں سخن دان کی ٹیم کے لیے اس بہترین کاوش پر ایک بار پھر مبارک باد اور دعائیں۔

شہزاد احمد شاذ